

اُردو سرکی اپنے تدارکات

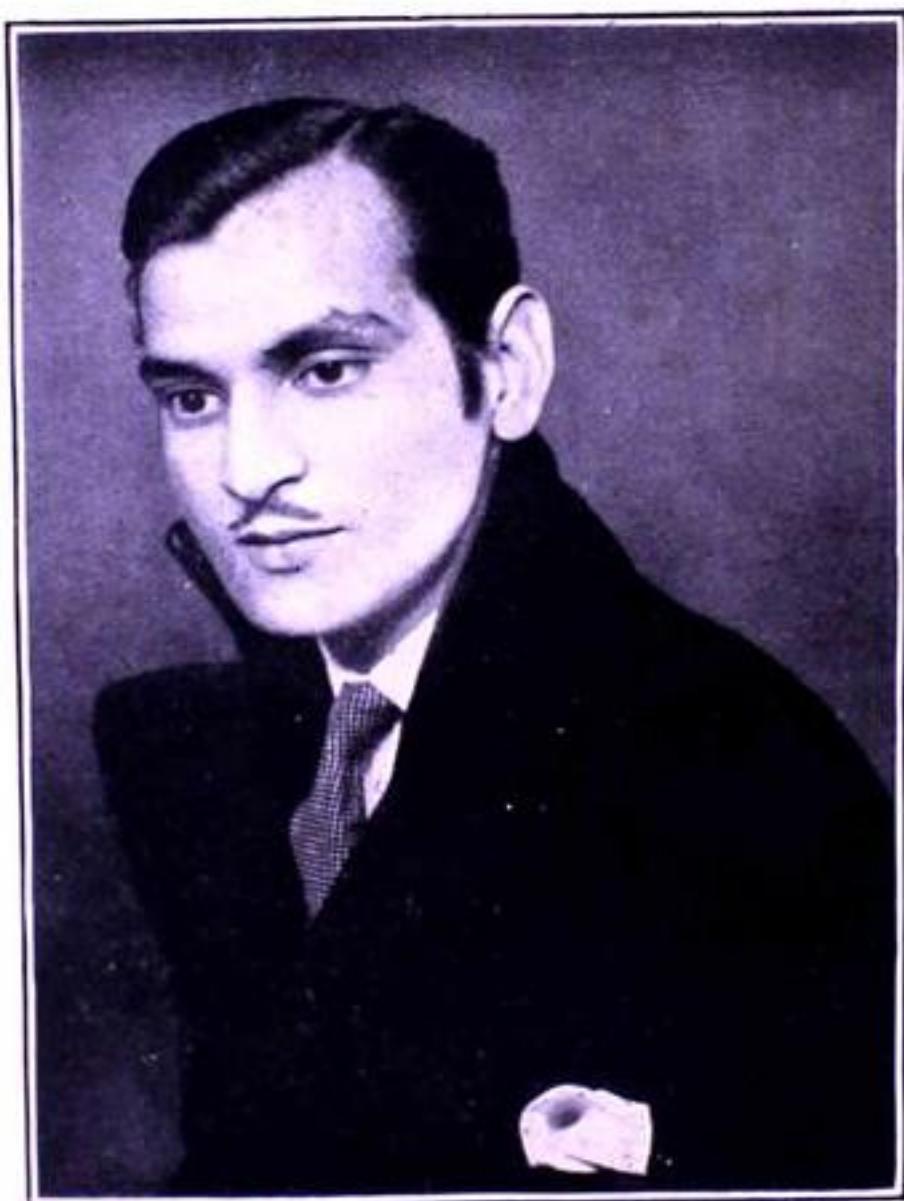
از

آفتاب احمد صدیقی ردولوی (عیدگ)

اُردو سرکی ابتداء اور ارتقاء

از

آفت ب احمد صدیقی ردولی (عینگ)



آفتاب احمد صدیقی عبھی (دیاری آندر فائیل)

پنی بہن نبیضہ
کے نام

جس کی اب صرف یا و باقی ہے

(آفتاب،

آردو شرکی ابتداء اور ارتقاء

ادب اور ارتقاء پچاس برس سے کچھ اور پہلے ہیں جب مغربی مفکرین نے ارتقائی مسائل کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا ہوں تو پہلے پہل اس اصول کو صرف حیات حیوانی کے سلسلہ میں کام میں لایا گیا لیکن رفتہ رفتہ یہ میدان دستین ہوتا گیا اور ہر قسم کی علمی تحقیقات میں ارتقائی پہلو کا مطالعہ اہم اور ضروری سمجھا جانے لگا، اب اخلاقیاتی رعنی ~~دین و حکم~~ ایس ہر فعل خواہ ارادی ہو یا غیر ارادی اسی ارتقاء کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے۔ نفیات میں بھی اب ارتقار کی مدد سے دماغی کمزور کسار کا بیان ہوتا ہے۔ عرض ہماری زندگی کا ہر پہلو اب ارتقائی نظر اور نظریہ کے ماتحت دیکھا اور پر کھا جاتا ہے۔

اس ارتقائی مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہم اپنے زمانے کی چیزوں کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، ایک انجان شخص اس ذمیا اور اس کے لوازمات کو دیکھ کر حیرت میں رہ جاتا ہے کہ آخر یہ چیز کس طرح ٹھوڑی میں آئی ہو گی لیکن جانتے والا جانتا ہے کہ یہ ارتقاء کا نتیجہ ہے، ازندگی ترقی کر رہی ہے اور ترقی کرتی رہی سمجھدار اور دانا وہی ہے جو اس ترقی کی رفتار اور سمت پر نظر رکھ کر خود ترقی کر سکے۔

یہ کسی کو نہیں معلوم کہ زندگی کب اور کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں ختم ہو گی لیکن پھر وہ معلوم ہے کہ دنیا ایک خاص سمت کی طرف جا رہی ہے اور اس کے جانے کی خاص رفتار ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ارتقار کی اس سمت اور رفتار کو ملاحظہ کر کر خود اس ترقی کی دوڑیں حصہ لے سکیں۔

اسی نظر سے ادب کا جائزہ لیجئے، ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ادب زندگی کا آئینہ دار ہے، جیسے جیسے زندگی ٹھیک رہی ہے ادب بھی ترقی کرتا رہا ہے، ازندگی نے جو منزليں طے کی ہیں ادب بھی ان را ہوں سے گزر رہے لیکن زندگی کا جو حصہ گذر اگزر گیا جو وقت نکلا نکل گیا، اب وہ پہلے پہل کی زندگی کتنی ہی

دچھپ اور کتنی ہی زنگین کیوں نہ معلوم ہواں کا لوث آنا ممکن نہیں لیکن ادب ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہیگا اور اس کے ساتھ ہی وہ زندگی کی آن تمام زنگینیوں، لطفتوں اور کشمکشوں کو دکھاتا رہیگا جن کا وہ علیبردار ہے، ہر زمانہ کا ادب اُس عہد کی زندگی کی یادگار ہے یہ ایک ایسا مرقع ہے جس میں ماضی اور حال کا زندگ مل کر مستقبل کی ہلکی سی جھلک دکھاتا ہے۔

آردو کا بازار آج کیسا گرم ہے لیکن اس کا ماضی بھی کم شاندار نہیں، ایک طرف صوفیوں کی محفل گرم ہے، حال و قال کی مجلسیں ہو رہی ہیں عرب اور ایران سے آنے والے ہندوستان آکر ہندوستانی وضع قطع ہندوستانی بیاس ہندوستانی چال ڈھال اور سب سے بڑھ کر ہندوستانی زبان پر اپنا مبارک ہاتھ رکھ رہے ہیں، اور زبان کی بسم اللہ ہو رہی ہے۔

اس کے بعد جو تصویر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ دکن میں مسلمان بادشاہوں کے دربار جمی ہوئے ہیں اور بادشاہ بھی کیسے جو خود عالم فاضل شاعر اور شاعر شناس ہیں، خود صاحب دیوان، نہاروں شعر کی مشنویاں کہنے والے دیے ہی درباری رزم بزم حسن عشق چنگ فتح ہرنگ کی مصوری کرنے والے، بیعتوں میں زنگینی بھری ہے وہی قلم سے پٹکی پڑتی ہے۔

یکایک یہ سماں بھی بدل جاتا ہے، اب انکھوں کے سامنے صاحب قرآن کی اولاد کا دربار ہے، دل کا شہر دنیا بھر کے شرفاء اور اہل مکال کا مرجع، جسے دیکھو تو اس سے بڑھ کر تمہیر سخن کا دہنی، جسے دیکھو علم و فضل پرنا زان پانے کمال کے ایسے نہونے پیش کر رہا ہے کہ دیکھنے والے حیران ہیں۔

زمانہ کا رُخ بدلتے ہی تصویر کا زندگ بدل جاتا ہے، دلی اجر درہی ہے، معلوم کی حکومت چراغ سحری ہے، لوگوں کا مناق بگڑا چکا ہے۔ ادب بھی دیں ہی تضع آیزرا اور بتا دیں ہے جسی خود ادیبوں کی زندگی۔ زندگی کی کروٹ بدلتے ہی انگریزوں کا ستارہ اقبال بلند ہوتا ہے، زبان بھی نئے آئیوالوں کے گھنے پڑتے ہے فورٹ دیم کا لمح میں زبان ایک نئے اسلوب سے بن سور کر نکلتی ہے۔

اب زمانہ آپنے کہ سر سید کی تحریکات شروع ہو چکی ہیں، آردو بھی اپنے محن کے اشاروں پر چلنے

لگتی ہے اور ایسی راہ نکلتی ہے کہ حالی شیل، مذیر احمد، ذکار اللہ سب اُس پر گامزن ہوتے ہیں، اسی راہ پر شرمنشار ملتے ہیں۔ یہیں عصر حاضر کے مقصود اپنے مرقعے لئے نظر آتے ہیں:-

یہ ہے ہماری زبان کے دلکش مرقعے کی اجمالی کیفیت آئی ہے اس کی نشر کا تفصیل مطالعہ کریں۔

اُردو شر کا پہلا دور

مذہبی اُردو

اُردو شر کی ابتداء ساتوں صدی ہجری سے کنایا چاہئے، اس سے یہ مطلب نہیں کہ یہ زمانہ اُردو کی اولین تاریخ کا زمانہ تھا ہاں ارتقائی منازل میں یہ وہ زمانہ تھا جب اُردو بالکل بچپن کی حالت میں تھی، اس وقت تک عدالتی زبان فارسی اور ہندوؤں کی زبان ہندی تھی۔ ہندو اور مسلمان باوجود ایک ملک میں رہنے کے مذہب تکنون معاشرت اور زبان کا اعتبار کی بالکل علیحدہ تھے لیکن اسی علیحدگی اور چھوٹ کا فائم رہنا بڑا مشکل ہے، مذہب بالکل انفرادی چیز ہے اور ممکن ہے وہ اپنی انفرادیت قائم رکھ سکے لیکن زندگی کی ہر دوسری چیز اس میں جوں اور ربط ضبط سے اثر قبول کرتی ہے، معاشرت اور اُس کے ساتھ ہی زبان کا بدلنا لازمی ہے۔

زبانوں میں اس قسم کی تبدیلیاں ابتدأ اُمرت عام گفتگو اور روزمرہ کے کار و بار تک محدود رہنی ہیں یعنی دونوں زبانوں میں ضرورت کے لئے ایک دوسرے کے الفاظ لائے جاتے ہیں یہاں تک کہ ایک ایسی زبان جو دونوں سے مختلف ہو اور دونوں سے مل کر بنی ہو وجوہیں آجاتی ہے، یہ زمانہ زبان کی طفویلیت کا ہوتا ہے۔ الفاظ کا سرما یہ بہت مختصر اور محدود ہوتا ہے، استعارات اور شبیہات کی گنجائش نہیں ہوتی۔ علمی مصطلحات اور سچیدہ اسالیب بیان بھی ناپید ہوتے ہیں۔ ساتوں صدی ہجری میں اُردو اسی عالم میں تھی اور اسی دور سے گذر رہی تھی۔

اس دور میں اُردو شر پر مذہب کا سب سے گہرا اثر بڑا، اس کا اصل سبب یہ تھا کہ ہندی نژاد مسلمانوں کی تعلیم کی طرف سے صوفی اور علماء اتنے بے پرواہ تھے جنے آج ہیں اُن کی تعلیم اور ترزیکیہ نفس

کے لئے عربی و فارسی کا استعمال مناسب نہ تھا اول تو سب مرد بھی عربی و فارسی پر قدرت نہیں رکھتے تھے اور عورتیں تو شایدی اپنی زبان کے علاوہ کسی زبان کو سمجھ سکتی تھیں لہذا ان کی تعلیم کے لئے ان کی زبان کا اختیار کرنا بھی ناگزیر تھا۔ علاوہ بریں تبلیغ کے لئے دلیسی اور عوام کی زبانیں ہی زیادہ مناسب ہیں، گوتم بدھ نے ماگدھی کو اپنے مذہب کی اشاعت میں لیا، عیسائی مشنریوں نے بھی اولاً آردو زبان میں چھوٹے چھوٹے پمفت تقسیم کئے ان میں سے اکثر کی زبان بجدہم اور سلیس ہے، اسی بناء پر اس دور کی تصانیف میں مقامی بولیوں کا رنگ بیدار نہیں رکھتا ہے۔

اس دور کی تصانیف قدیم تذکرہ نگاروں نے فضیلی کی وجہ مجلس کو آردو نشر کی اولین تصنیف لکھا ہے لیکن بعد میں تحقیقات کے رو سے چند ایسے مصنفوں کا پتہ ملا ہے جو فضیلی سے کئی صدی قبل گزرے ہیں، ان میں خواجہ اشرف جہاں گیر سمنافی علیہ الرحمہ کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، حضرت موصوف کی پیدائش ۶۸۸ھ مطابق ۱۲۸۹ء میں ہوئی، آپ کی تصنیف سے ایک رسالہ تصوّف باقی ہے جس کا سنہ تصنیف ۷۳۰ھ ہے اب اسی کو آردو نشر کی اولین تصنیف قرار دیا جاتا ہے، اس کی زبان باوجود قدامت کے آسان سمجھی جا سکتی ہے مثلاً، ”اے طالب آسمان زمین سب میں خدا ہے جو تحقیقی جان اگر تجویں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بھی تام ذات ہی ذات ہے“

اس عہد کے دوسرے مشہور مصنف حضرت شیخ عین الدین گنج العلم میں، ان کی زبان اس عہد کی دلکھنی آردو کا نمونہ ہے لیکن حضرت موصوف خود وکنی نہ تھے آپ کی پیدائش ۷۳۰ھ میں مقام دہی ہوئی، ایام جوانی میں تحصیل علم کے شوق میں گجرات وغیرہ کی خاک چھانی، آخر دوست آباد آکر دم لیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ دولت آباد کی قیمت جاگ رہی تھی اور سلطان محمد بن تعلق ۵۲-۷۵ھ کا دارالحکومت تھا، اس وقت پہاں صوفیہ کرم کا اچھا خاصاً مجمع تھا۔ سید خوند میر علاء الدین حسینی، شیخ شمس الدین، شیخ منہماج الدین تیمی الانصاری صیے بلند پایہ بزرگوں سے اکتساب فیض کا موقع تھا، شیخ عین الدین گنج العلم حضرت علاء الدین حسینی کے مرید ہوئے اور حضرت شیخ منہماج الدین علیہ الرحمۃ سے اکتساب علوم روحانی کی امور بخوبی مذکور ہے کہ

۱۳۷۸ء میں بھاپور تشریف لائے، سلطان علاء الدین حسن بہمن کا زمانہ دیکھا اور اُس کے چار جانشینوں کا عہد بھی آپ کے سامنے گزرا، مولف اردوئے قدیم کا بیان ہے کہ آپ نے چھوٹے چھوٹے کئی رسائلے دکھنی زبان میں تصنیف کئے تھے منجملہ ان کے تین رسائلے ایک مجموعہ میں یعنی جابری کا بح کے کتب خانہ میں موجود تھے، ان کے اوراق کی مجموعی تعداد چالیس تھی اور ان میں فرائض و سنن کے متعلق مختلف احکام اور سائل تحریر تھے،

اس دور کی ایک بہت مشہور کتاب معراج العاشقین ہے جو طبع ہو چکی ہے، اس کے مصنف حضرت بندہ نواز خواجہ محمد گیسو دراز علیہ الرحمۃ ہیں، آپ کو کئی مُعْتَدِلین نے دکن کوارڈوگی ترقی میں اولیٰ رت کا فخر بخشنے کی خاطر دکھنی لکھا ہے حال آنکہ آپ جس وقت دکن تشریف لائے آپ کی عمر تقریباً ۹۵ سال کی تھی، آپ کی پیدائش ۱۳۲۰ء میں مطابق ۱۴۰۰ھ میں بمقام دہلی ہوئی۔ آپ خواجہ احمد لصیر الدین چرانع دہلوی کے مرید اور خلیفہ تھے، خرقہ خلافت ملنے پر آپ گلبرگہ تشریف لے گئے اور وہ زمانہ فیروز شاہ بہمن کا تھا، یہ واقعہ ۱۴۰۵ھ کا ہے، وفات آپ کی احمد شاہ بہمنی کے عہد میں ۱۴۲۵ھ میں ہوئی آپ کی بزرگی کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ اکثر شاعروں نے آپ کے خاندان سے بیعت ہونے پر فخر کیا ہے، مثلاً نصرتی اپنی ایک مشہور مثنوی میں آپ کی مدح میں بیان کرتا ہے:-

بحمد اللہ کرسی بکرسی مری چلی آئی ہے بندگی میں تری
جو ہوں میں بھی بندہ اسیر ہوا جو گیا ہوں تجھ بندگی میں سدا

آپ شاعر بھی تھے اور ایک بلند پایہ مصنف بھی الصوف کی تقریباً ۳ کتابیں آپ نے تصنیف کیں اکثر عربی و فارسی کی کتابوں پر حاشیہ کیا۔ آپ اپنے ہندوستانی شاگردوں کو ان ہی کی زبان میں تعلیم دیا کرتے تھے اور اکثر دینی رسائلے بھی آپ نے ایسی زبان میں مرتب فرمائے، آپ کی تصانیف میں تفسیر کلام اللہ حاشیہ الکتاب، کتاب الاسرار، معراج العاشقین، ہدایت نامہ وغیرہ زیادہ مشہور ہیں، معراج العاشقین اُس عہد کی زبان کا جو دکھنی میں بولی جاتی تھی اچھا نمونہ ہے۔

”اے عزیز مرید صادق، اچھے پیر کے سوا کون امر خدا ہو، رسول پیدا کیا ہے اپنی بونج کوں، حمدگوں ہی ہے نصیحت کرنے کوں، اس بات میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں پیر کوں درکار ہے دس چیزیں مجھے سواس پر فرض ہوتا ہے۔ اول علم اچھے دانائی کا بونج کا، دوم سخاوت اچھے دل کا، سوم عمل اچھے دانائی کا، چہارم مرید کے مال سوں نظر نہ کرنا حرص کا، پنجم نادانی کی بات ناکرے مریدان میں، ششم عقل اچھے ہفتہم شیعہت اچھے، هشتم یاد میں رہنا، نهم حال پر حال ہوئے، دہم سو بونج کا مالک ہونا۔“ (معراج العاشقین، صہارت خاتمه)

دکنی مصنفین کی ابتدائی نثر کی کوششوں میں شید محمد عبد اللہ حسینی کا ترجمہ نشاط العشق من تصنیف حضرت محی الدین عبد القادر جیلانی علیہ الرحمۃ اور میران جی شمس العشاق کی جل ترجمگ اور محل باس بھی قابل ذکر ہیں۔ اس دور کی اردو نثر اگرچہ یہ سب اردو نثر کی ابتدائی کوششیں تھیں لیکن ان میں زبان حتی الوسع کی خصوصیات سادہ اور صاف استعمال کی گئی ہے، تعقید اور تصنیع سے حتی الامکان گریز کیا گیا ہے لیکن اولین کوشش ہونے کی وجہ سے بعض مقامات پر عبارت اٹھی ہوئی اور گنجدک معلوم ہوتی۔ یہ بھی ممکن ہے اس ہد سے اس قدر بعد زمانی ہونے کے سبب سے ہم بعض عبارتیں پوری طور پر سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

بعض حضرات مذکورہ بالتصانیف کو اردو زبان کا نونہ تسلیم کرنے میں تامل کرتے ہیں، آن کے نزدیک اسے اردو کہنا ہی درست نہیں وہ اسے دکھنی سمجھتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ میش کرتے ہیں کہ دکھنی الفاظ جو اردو والوں کو نامانوس معلوم ہوتے ہیں ان تصانیف میں بکثرت استعمال ہوئے ہیں لہذا اس زبان کو دکھنی کہنا ہی مناسب ہوگا، لیکن آج کا انگریزی داں اردو بولنے والا اپنی گفتگو میں انگریزی الفاظ اس قدر شدت سے استعمال کرتا ہے کہ سوائے افعال اور وابطے کے اس میں اردو کی بوہی نہیں ہوتی لیکن کوئی انگریزی زبان کو انگریزی نہیں سمجھتا، یہ انگریزی کی اس قدر آمیزش کے بعد ہی اسی قرار پاتی ہے، لہذا اگر قرداد میں

اُردو میں دکھنی الفاظ زیادہ ہیں تو اس سے وہ زبان دکھنی نہیں ہو سکتی، وہ اُردو کی ایک ابتدائی شکل تھی جس میں مقامی زنگ زیادہ غالب تھا اور یہ مقامی زنگ ہر زمانہ اور ہر زبان میں پایا جاتا ہے، آج بھی اُردو بولنے والے سیکڑوں مقامی الفاظ، اصطلاحات، کہاویں، ضرب الامثال وغیرہ استعمال کرتے ہیں اور اس قسم کے مختلف نمونوں کو اگر جمع کیا جائے تو وہ ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود اُردو زبان کے ہی نمونے قرار پائیں گے۔

ندیمی مباحثت کی مناسبت سے اس قدیم دور کی تصانیف کی عبارت میں ندیمی مصطلحات بھی بکثرت استعمال کئے گئے ہیں، بہت سے خالص عربی اور فارسی الفاظ بجنسہ اُردو میں استعمال ہونے لگے اور یہ ایسے الفاظ اور مصطلحات تھے جن سے ہر مسلمان کم و بیش آشنا تھا۔ ہماری موجودہ ندیمی مصطلحات زیادہ تر اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

دوسری صدی ہجری کے بعد دکن میں اُردو شتر کی ترقی

اُردو کے ابتدائی دور میں زریں عہدوں ہے جو دکھنی بادشاہوں کی سرپرستی میں گذراں ہیں سلاطین قطب شاہی، سلاطین گو لکنڈہ اور بیجا پور خاص طور پر قابل ذکر ہیں، قطب شاہ جو ۹۸۸ھ سے شاندیہ تک بر سر حکومت رہا ایک قادر الکلام شاعر اور علم دوست فرمازرو اتحا، اس کا ہم عصر ملاوجی جو اس کے دربار سے والبستہ تھا اُردو یہ قدیم کی دنیا کا ہیرو ہے اُس کی بہترین تصانیف نظم میں شنوی قطب مشتری اور شتر میں سب رس موجود ہے۔ قطب مشتری کا ایک نسخہ انڈ یا آفس میں موجود ہے اور سب رطبع ہو چکی ہے۔

یہ دور دکن میں شنوی کا دور تھا چنانچہ قطب شاہی دور میں وجہی کی قطب مشتری غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال، احمد کی مصیبت اہل بیت، ابن نشاطی کی پھول بن، طبعی کا قصہ بہرام و گل اندام امین کا قصہ

ابلوشحہ، خواص کا قصہ حسینی، سیوک کاجنگ نامہ، فائز کا قصہ رضوان شاہ و روح افرزالطیف کاظف نامہ سب کی سب مثنوی کی طریقے نظم ہوئیں یہی حال دوسرے سلاطین کے دربار کا تھا، عیش و عشرت اور بزم طرب کا ہر جگہ چرچا تھا لہذا بزمیہ مثنویاں جن میں حُسن و عشق ہجرو وصال اور فرضی قصہ کہانیوں کا بیان ہوتا زیادہ پسند کی جاتیں، ایسی چیزیں فارسی ادب سے بکثرت مستعار لی جاسکتی تھیں، چنانچہ مذکور الفصل مثنویاں زیادہ تر فارسی کا ترجمہ ہیں۔

اس کا اثر نظر پر یہ ہوا کہ اکثر کتابیں فارسی سے ترجمہ کی جانے لگیں، چنانچہ ملاؤ جہی کی سب رس ایک فارسی قصہ حُسن و دل سے ماحوذ ہے، مصنف نے اس کو اپنی دماغی اُتیچ کا نتیجہ بتایا ہے لیکن اصل فارسی کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد یقین ہو جاتا ہے کہ مصنف نے فارسی قصہ سے فائدہ آٹھا یا ہے، اسی طرح میرزاں یعقوب کی شمائل الاقیاء اور شاہ ولی اللہ قادری کی معرفت السلوک فارسی سے ترجمہ ہیں۔

اس عہدی کی تصانیف مذہبیت کا زنگ اب بھی غالب تھا اور اس دور کی مشہور کتابوں میں مولانا عبد اللہ اور ان کے مصنفوں کی احکام الصلوٰۃ، میرزاں یعقوب کی شمائل الاقیاء، شاہ ولی اللہ قادری کی معرفت السلوک، سید شاہ محمد قادری کے رسائل تصوف پر، سید شاہ میر کا رسالہ اسرار التوحید اور مولانا باقر آغاہ کی تصانیف سب مذہبیت کے زنگ کو نطاہر کرتی ہیں۔

احکام الصلوٰۃ کی تصانیف ۳۲ سالہ میں ہوئی، اس کے مصنفوں مولانا عبد اللہ ہیں اور اس میں نماز اور اُس کے متعلقات بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) بات کرنے سوں نماز جاتا، نماز میں آدمیاں کی مثال دعا مانگنے نماز جاتا، یہی وہ کہنے نماز جاتا ڈرسوں یا مصیبت سوں نماز جاتا، روئے سوں یا ذیا کے سبب سوں نماز جاتا۔ نماز میں کسی کی موت کی خبر سنکرنا اللہ و انا الی الراجعون بولتے سوں نماز جاتا، جب عجب سنکر نماز جاتا، یا ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

(۲) روح قبض ہوا اُسی وقت اُسکیاں انکھیاں مونچنا ہوا پانوں دراز کرنا ہوا ہات دراز کرنا دنو

پہلو کی طرف ولیکن یعنی پر نار کھنا ہو رہا اس کی ٹھوڑی ہو رہا سرکوں ملا کر بند کرنا اسے بز خداں بولتے ہیں یوسف صدیق ہے، ہو رہا نے تے اول اس کے سرکوں قطب کی طرف سلانا ہو رہا موے بعد ازاۓ غسل دینا اس طبق سب اسی عہد کی ایک دوسری کتاب مفتاح الخیرات ہے:-

(۳) ایمان کی حکایت کا معرفت ہو رہا احکام ہو دار کان چھاننا تمام مسلمان پر فرض ہے کہ سب کوں اس کی چھانے چھٹکا را ہے ہو رہا آخرت میں خدا کے عذابوں گرفتار نا ہو یہاں اگر تجھے پوچھیں گے ایمان کیا ہے بول تو ایمان اقرار کرنا ہے زبان کے تین ہو رہا استوار کرنا ہے دل میں خدائے تعالیٰ یک ہے بغیر اس ایک خدا خارج دوسرانہیں ”

یہی نبوۃ شاہ ولی اللہ قادری کی معرفت السلوک کا ہے:-

(۴) بولتا ہے کمترین مرید ہو رہا پس تین شاگرد جاروب کش درگاہ عالی ابالی عاجز فیقر الحیر محمد ولی اللہ حکم کے مجھوں حضرت شہیاذ ولایت معدن ہدایت آفتا ب عالمتا ب رہرگ اویا کے (بڑے القیا کے) (ہو رہا صدر نشین محمد مصطفیٰ کے) رضا حب شریعت ہو رہ طریقت کے دربار ہو رہ معرفت کے رواثت محمد رسول اللہ حضرت شاہ جیب اللہ قادری باقی رکھا اللہ انوں کوں)

اس عہد کی اردو شعر با قرآن نے اپنی ایک تصنیف میں لکھا ہے:-

کی خصوصیات ہے ”بعض علماء متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں تاکہ دہ لوگ جو عربی ہنیں سمجھ سکتے ہیں ان سے فائدہ پاویں، لیکن اکثر عورتیاں اور تمام آدمیاں فارسی سے بھی آشنا نہیں اس لئے یہ عاصی بہ طلب ان کے بہت اختصار کے ساتھ لیکر دکنی رسالوں میں بولتا ہے “

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں فارسی کے ترجموں کی مانگ زیادہ تھی چنانچہ نظم اور نثر دنوں میں فارسی کتابوں کے ترجمے ہونے لگے، اس سے ایک تو فارسی الفاظ محاورے استعارات اور شبیہات اردو میں آنے لگے دوسرے فارسی خیالات اور اسالیب نے بھی اردو میں

راہ پائی، اس نظر ہوری کا تسع اردو میں ہونے لگا اگرچہ اس طرز کے بہترین نمونے اس دور کے بعد ہی ملتے ہیں لیکن آن کی ابتداء ہیں سے ہوتی ہے، چنانچہ سب رس جس پر ابھی انہار خیال کیا جائیگا اسی طرز عبارت کا نمونہ ہے۔

چونکہ زبان بہت کچھ ترقی کر چکی تھی لہذا مذہبی کتابوں کے علاوہ دوسرے مباحث پر بھی کتابوں کی ابتداء ہوئی، الفاظ کا سرمایہ اگرچہ ابھی اتنا دسیع نہ ہوا تھا کہ خالص علمی مصاہین کی کوشش کا میاب ہوتی لیکن وہ زمانہ ضرور آپنے چاہیا جمال زبان تخلیل کا ساتھ دے سکتی ہے، لہذا اس دور کی تصانیف میں مذہب کے علاوہ قصے اور کہانیاں لکھنے کی کوشش کی گئی اور یہی بحث آئندہ دور میں مخصوص ہو کر رہ گیا۔

زبان کی ترقی کے ساتھ ہی عبارت بھی زیادہ سلیمانی اور صاف ہو گئی وہ گنجدک اور الجھن جو ابتدائی کتابوں میں پائی جاتی ہے کم ہو گئی۔

مذکورہ بالاتمام خصوصیات کے مطالعہ کے لئے وجوہی کی مشہور تصنیف سب رس کافی ہے جو سلطان عبد اللہ قطب شاہ کی فرمائش پر لکھی گئی چنانچہ دیباچہ میں لکھتا ہے:-

”سلطان عبد اللہ نسلِ اللہ، عالم پناہ، صاحب سپاہ، حقیقت آگاہ، دشمن پرور ثانی سکندر، عاشق صاحب نظر دل کے خطرے تے باخبر..... . مبایک وقت بیٹھے تخت، یکایک غائب تے رمز پاک، دل میں اپنے کچو لیا کر وجہی نادر من کون دریا دل گوہ سخن کون حضور بلائے، پان دئے، بہت مان دئے ہو رفرمائے کہ انسان کے وجود پر میں کچھ عشق کا بیان کرنا، اپنا نالوں عیار کرنا، کچھ نشان دھرنے وجہی بھوگنی گن بھریا، تسلیم کر کر سر پر پہات دھڑبا، بھوت بڑا کام اندیشیا، بڑی فکر کریا، بلند ہمتی کے بادل تے داش کے میدان میں گفتار ان برسایا، قدرت کے اسرار ان برسایا، بادشاہ کے فرمائے پر چتیا، نوی تقطیع بیا۔“

تاریخ تصنیف اس کتاب کی ۱۸۷۵ء میں ہے،

”بارے جسوقت تھا ایک ہزار چھل د پنج اس وقت ہلو رکڑیا یہ گنج کتاب کا مأخذ۔“

وجہی نے کہیں اس امر کا اعتراف نہیں کیا ہے کہ یہ قہد اُس نے کیسے اور کہاں پایا، دیباچہ ٹڑھنے سے

ہر عکس بھی شبہ ہوتا ہے کہ یہ قصہ دجھی کے دماغ ہی کی ایجاد ہے اور اس پر اس نے جا بجا فخر کیا ہے لیکن سب سے پہلے یہ قصہ محمد بن حنبلی ابن سیبک فتاویٰ میشاپوری نے جو خراسان کے مشاہیر میں تھے لکھا یہ زمانہ شاہرخ مرزا کا تھا، فتاویٰ کی وفات ۲۵۲ھ میں ہوئی علاوہ فتاویٰ کے اسراری اور خماری بھی تخلص کرتے تھے، علاوہ کئی دیوانوں کے ان کی اور بھی بہت سی تھائیف ہیں جن میں دستور عشق یعنی قصہ حسن و دل بہت مشہور ہے سب رس میں اگرچہ اس طرف کہیں اشارہ نہیں کیا گیا کہ یہ کتاب دستور عشق کو دیکھ کر لکھی گئی لیکن دونوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وجھی نے قصہ کی واردات حرف بحر فتاویٰ سے لی ہے، دستور عشق ایک مثنوی ہے جسے نشر کی صورت میں خود فتاویٰ نے قصہ حسن و دل کے نام سے لکھا تھا، وجھی نے بھی شاید اصل دستور عشق کو نہیں دیکھا، اس کی نظر سے حرف نشر کی حسن و دل گذری تھی اور اسی پر اس نے اپنے قصہ کی بنیاد رکھی ہے۔ اپنی طرف سے صرف یہ اضافہ کیا ہے کہ جا بجا موقع اور بے موقع پہنچ دو غلطت کا ذفر کھول دیا ہے جس کا اصل کتاب میں ذکر نہیں باطرز تحریر میں بھی وجھی نے فارسی نثر کی نقل اڑائی ہے اور وہی مجمع اور متفقی عبارت لکھی ہے، مثلاً

(۱) دنیا میں خوب گنوائی، چار لوگوں میں عزت پائی، جان رہے کھڑے وال قبول پڑے، زافت دیکھی نہ زلزلہ اپے بھلے تو عالم بجلاء، کسی کون برا بولنا یو دسواس ہے۔ بھلانی بڑائی سب اپنے پاس ہے۔
سب رس پر تصریحہ۔

سب رس پہلی کتاب ہے جو اردو نثر میں ادبیت کے نقطہ نظر سے کوئی اہمیت رکھتی ہے، عبارت یہں جو قافیہ کا التراجم رکھا گیا ہے اس سے اکثر مقالات پر لکھن اور آدرو صاف ظاہر ہے اور عبارت مخفی نک بندی ہو کر رکھی ہے اور ادائے مطلب میں بھونڈا پن آگیا ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو سب رس میں بید فصاحت روائی اور سلامت پائی جاتی ہے، حال کے زمانہ میں فسانہ عجائب و غیرہ بھی اسی انداز پر لکھی گئیں لیکن بیان کی سادگی میں سب رس یقیناً ان سب سے بہتر ہے یہ ضرور ہے کہ اس کی زبان قدیم ہے اور پرانے الفاظ اور محاذات آج کل سمجھ میں نہیں آتے لیکن اس میں نہ مصنف کا قصور ہے اور نہ اس سے کتاب کی خوبی پر کوئی حرفاً اسکتا ہے اس نے اپے زمانہ کی ہمایت بیامجادہ اور فصیح زبان لکھی ہے چنانچہ وہ خود بھی کہتا ہے

اور اس سے ہمیں بھی کامل اتفاق ہے کہ

”آن لگن کوئی اس جہاں میں ہندوستان میں ہندی زبان سو اس لفاظ اس چند ان سے
نظم ہونے ترملائکر گلا کرنے نہیں بولیا“

اس جملے میں وہی نے اپنی زبان کے لئے ہندی کا فقط استعمال کیا ہے اُس کو دکھتی نہیں کہا ہے کیا اس
کے بعد بھی اس قسم کی زبان دکھنی کے بجائے اردو ہکلنا نے کسی سختی نہیں کتاب سے اُس عہد کی زبان کا اچھا
اندازہ ہو سکتا ہے، بہت سے الفاظ اور محاورات ایسے ہیں جو اب بالکل متروک ہیں اور خود اپنے دکن بھی
نہیں سمجھتے، فارسی کے ساتھ ہندی کے الفاظ بھی بکثرت استعمال کئے گئے ہیں۔ جہانتک محاورات کا تعلق
ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض محاورات اس وقت بھی لعینہ اسی طرح استعمال ہوتے تھے جیسے آج کل
مثلاً شان نہ گمان، خالہ کا گھر، کہاں گناہ کا تیل کہاں راج بھونج، گھر کے بھیدی سے لٹکا جائے، شرم حضوری
دیکھا دیکھی، چائیں مائیں کھیلنا، اُس عہد کی قواعد صرف و نحو کا اندازہ کرنے میں سب رس سے بڑی مدد
ملتی ہے۔

(۱) مذکرا اور مونث دونوں کی جمع ان سے آتی تھی، ہاتان، جھاڑان، کتابان، بھائیان۔

(۲) ہمارے موجودہ صرف و نحو میں ایسے افعال متعددی جن کی ماضی مطلق، ماضی قریب، ماضی بعید،
ماضی احتمالی کے ساتھ ”نے“، آتا ہے تو فعل ہر حالت میں مذکرا استعمال ہوتا ہے خواہ فاعل مذکر ہو یا مونث، لیکن
سب رس کی عبارت میں مذکر کے لئے مذکرا اور مونث کے لئے مونث فعل استعمال ہوا ہے۔

مثلاً اس عورت نے کہی، لڑکی نے پانی پی۔

(۳) نے، کا استعمال بے قاعدہ ہوا ہے اور یہ بے قاعدگی میر و سواد کے نتائج کے قائم رہی۔

(۴) فاعل مونث جمع کی صورت میں فعل بھی مونث استعمال ہوتا تھا، مثلاً

”ہمیں عورت ان اپنے مرد یغزوہ سرے کو اپنا حسن دکھانا گناہ کر جانتیاں ہیں، اپنے مرد کوں

ہر دو جہاں میں اپنے دین واپس کر پھانتیاں ہیں۔“

(۵) موت کی صورت میں حرف اضافت "کی" جمع آتی تھی "دل کے فائدے کیاں بہت باتاں ہیں" ،
الیسی جیسی کی جمع ایسیان، جیسان استعمال ہوئی ہے۔

(۶) ہماری موجودہ اردو میں ایسے مصادر کی ماضی مطلق جن میں علامت مصدر سے قبل الف یا او اور
نہیں ہوتا۔ اس طرح نبنتی ہے کہ امر کے آگے الف بڑھادیتے ہیں مثلًا دیکھنے سے دیکھا لیکن سب رس میں بجائے
الف کے یا استعمال ہوا ہے، دیکھنا سے دیکھیا، ملنا سے ملیا وغیرہ۔

(۷) مستقبل کے لئے سئی کا استعمال ہوتا تھا، نظر سوں خدا کوں دیکھیں گے تو خدا نظر میں نہ آسی،

(۸) کر کا استعمال جو میرامن کے ہاں بھی موجود ہے سب رس میں پایا جاتا ہے، وانا ہمنارہمنا کر جانے گا

(۹) اُس زمانہ میں ضمائر یوریہ، دو (وہ) انوکون (اُن کو) ہمنارہم کو، جنوں (جنہوں نے)
جنوں رجن کو، جنوں کا (جن کا) یہ (یہ) مستعمل تھے۔

(۱۰) الفاظ کے آخر میں 'تح' برائے تاکہ دا استعمال ہوتی تھی۔ یونچ یہ ہی۔

(۱۱) تذکرہ تانیث کا زیادہ خیال نہیں کیا گیا ہے شراب، چیز، صورت، دنیا سب مذکرا استعمال ہوئے۔

(۱۲) عربی الفاظ کا املا سادہ کر دیا گیا ہے، لفاظ (نفع) و ضرار (وضع) واقعہ رواقعہ۔

(۱۳) قافیہ کی بنیاد صورت یعنی اواز پر ہے، طمع کا قافیہ جما معنی کا قافیہ کھانا استعمال ہوا ہے۔

(۱۴) دو (ڈ)، یا ایک (ڈ)، اور ایک (ٹ) ہو تو پہلی (ڈ)، (ڈ) ہو جاتی ہے اگر دو (ر)، یا دو (ٹ) جمع ہوں ہوں
تو پہلی (ڈ)، اور پہلی (ٹ)، (ت)، ہو جاتی تھی۔

(۱۵) الفاظ کی تکرار کے موقع پر (ٹ)، کا اضافہ ہوا ہے، لفڑے لفڑے درے درے بعض جگہ (ٹ) کی جگہ (ٹ)، استعمال ہوا ہر
گھر میں گھر۔

اردو شرکا دوسرے دور

شمالی ہند کی اردو شر

شمالی ہند اور اردو شر | اردو نثر کا وہ انداز جو دکن میں پیدا ہو چلا تھا شمالی ہند میں اور بھی نکھر گیا، عبارت میں

زیگنی اور تکلف نے دخل پالیا اور زفہ رفتہ زبان ایسی بگڑائی کہ قافیہ ردیعت اور وزن کی بھول بھلیوں میں چندر
اُس کی ساری لطافت اور خوبصورتی ختم ہو گئی آج اس عہد کی بعض عبارتوں کو صحت کے ساتھ پڑھنا بھی فتوحہ
معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اسے زبان کا عیب نہیں کہا جاسکتا، باعتبار ترقی زبان مختلف حالتوں سے گزرتی ہے ابتداءً
صرف بول چال کے قابل سرمایہ موجود ہوتا ہے اور اسی مناسبت سے اسلوب بیان بھی نسبتاً سیدھا سادا
اور عام فہم ہوتا ہے لیکن زبان کی ترقی کیلئے الفاظ، استعارات اور شبیهات نئی نئی ترکیبیں نئی نئی اصطلاحیں درکار
ہیں اور جب تک یہ چیزیں پیدا نہ ہو لیں زبان آگے نہیں ٹڑھ سکتی، ہر زبان کی ترقی میں ایک زمانہ ایں
آتا ہے جب صرف ان چیزوں کا سرمایہ ٹڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے، انھیں کی مرد سے زبان اس
قابل ہونی ہے کہ روزمرہ کی گفتگو سے گذر کر زیادہ دلچسپ مباحثت کو بیان کر سکے، جن بزرگوں نے نئی نئی
جدتوں سے ہماری زبان کے لئے الفاظ، استعارات، شبیهات کنایا اور تراکیب کا بیش بہاذخیرہ
فراتم کیا ہے اُن کے احسان کا اعتراض نہ کرنا نکلم ہے یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اُردو میں
وسعت پیدا ہوئی اور ائمہ ترقی کی راہ کھلی۔

اس ابتدائی دور کی کتابوں میں نفلی کی وہ مجلس بہت مشہور ہے فضلی دہلی کے رہنے والے تھے۔
اور اُن کی زبان اُس عہد کی عام تحریری نظر کا اچھا نمونہ ہے، وہ مجلس کی سنة تصنیف ۱۷۵۰ء مطابق ۱۸۳۲ء
ہے، اکثر تذکرہ لگاروں نے اسے اردو نشر کی اولین کتاب لکھا ہے لیکن مذکورہ بالا بیانات سے اس
کی تردید ہو چکی ہے، اردو تو درکاریہ شمالی ہند کی اردو کی اولین تصنیف بھی نہیں قرار دی جاسکتی کیونکہ
خواجہ اشرف جہانگیر سمنانی کا مذکورہ بالا رسالہ اس کتاب سے کم و بیش ۴۰ صدی پہلے تصنیف ہو چکا تھا،
وہ مجلس کی زبان کا نمونہ یہ ہے۔

”پھر دل میں گذر را کہ اپنے کام کو عقل چاہئے کامل اور مدد کو طرف کی ہوئے شامل کیونکہ بے تائید
حمدی اور بے مد و جناب الحمدی یہ مشکل صورت پذیر نہ ہوئے اور گوہ مراد رشتہ امید میں نہ آوے

ہذا کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مختصر اور اب تک ترجمہ فارسی بعبارت مہندی نہیں ہوا مستمع، اب اندیشہ عمیق میں غوطہ کھایا اور تامل و تدبیر میں سُرگشته ہوا لیکن راہ مقصود کی پناہی، ناگاہ نیسم عنایت الہی دل فگار پر استہراز میں آئی یہ بات آئینہ خاطر میں منہ و کھائی،

اس دور کے مصنفین میں محمد حسین گلیم، عطا تحسین، سودا، شاہ عبد القادر اور انشاء اللہ خاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، عطا تحسین کی چہار درویش، شاہ عبد القادر کا ترجمہ کلام پاک اور انشاء اللہ خاں کی دریائے لطافت (اگرچہ فارسی میں ہے لیکن اردو و نثر کے بکثرت مضمون اس میں سلتے ہیں) اردو نثر کی مشہور اور مستند کتابوں میں شمارہ موئی ہیں، سودا بھی اپنی مخصوص طرز بعبارت کے لئے مشہور ہیں ان کی زبان کا نمونہ ان کا خود نوشتہ دیباچہ ہے جو ان کی کلیات کے ساتھ شامل ہے۔

”ضمیر منسر پر آئینہ دار ان معنی کے مبرہن ہو کہ حض عنایت حق تعالیٰ کی ہے جو طولی ناطقہ شہر بن سخن ہوا پس یہ چند مصرعے جو بقبیل رنجۃ در رنجۃ خامہ وزبان اپنی سے صفحیہ کاغذ پر تحریر پائے لازم ہے طویل سخن سامنہ بجاں روزگار کروں تازبائی ان اشخاص کی ہدیثہ مورد تحسین و آفرین رہوں۔“

اشراء اللہ خاں کا اور یائے لطافت اردو زبان کی تاریخ میں ایک اہم تصنیف ہے، اس میں اس عہد کے اردو بولنے والوں کے مختلف طبقوں کی بولیوں کا بہت اچھا نمونہ فراہم کیا گیا ہے جس سے اس عہد کی سانی حالت کا اچھا اندازہ ہوتا ہے مثلاً انشاء اللہ خاں اور مرا مظہر کی گفتگو کا جو نمونہ دیا گیا ہے وہ اس عہد کے پڑھ لکھ شرفوں کی زبان ہے، انشاء اللہ خاں کہتے ہیں۔

”ابتدائے سن و سال سے تا اوائل ریعال اور اوائل ریغان سے ناalan اشتیاق مالا یطاق یقبل امتکانہ علیہ نہ بجدعے تھا کہ تحریر و تقریر میں منظم ہو سکے لہذا بے واسطہ و سیلہ حاضر ہوا ہوں، اس کا جواب مرا مظہر دیتے ہیں۔“

”اپنے تیس کوں بھی بد و طفل سے تھیں ایسے اشخاص کے ساتھ موافقت اور مجالست رہا کی ہے، لیکن بی نورن کی گفتگو بالکل مختلف ہے۔“

”اجی اُو میر صاحب تم تو عید کے چاند ہو گئے، دلی میں آتے تھے دود و پھر رات تک مجھتے تھے اور رنجتہ پڑتے تھے لکھنؤ میں تھیں کیا ہو گیا کہ بھی صورت بھی نہیں دکھاتے اب کے کریم امین کتنا میں نے ڈھونڈا اکہیں تھارا انہر معلوم نہیں ہوا، ایسا نہ کچھو کہیں اٹھوں میں بھی نہ چلو تھیں علیٰ کی قسم آٹھوں میں مقرر چلو“

اس عہد کی نشر کی خصوصیات | اس دور میں فضیل کی دہ مجلس سے لے کر انشاء اللہ خال کی گفتگو تک مجب ایک طرز میں تحریر ہیں جس کی نایاب خصوصیت یہ ہے کہ فارسی ہر جگہ اردو پر بھاری ہے افادی عربی الفاظ، بعض تو سجاد تقلیل اور زاموس ہونے کے باوجود بکثرت استعمال کئے گئے ہیں، عبارت میں قافیہ اور ردیف کا التراجم رکھا گیا ہے۔ غرض یہ کہ ساری عبارت مخفی تصنیع اور آردو پر مبنی ہے، جیاں الفاظ کے ان گور کھو دہند ولی ہیں ایسا اب بحکم کر رہ جاتا ہے کہ پڑھنے اور سننے والے کو تکلیف محسوس ہونے لگتی، یہی طرز تحریر اردو میں عوامہ تک مقبول رہا اور جب علی بیگ سرور نے بہت بعد کے زمانہ میں بھی ایسی مقفلی اور بسح عبارت میں فسانہ عجائب لکھا، اس عہد کی زبان کا ذکر آگے ہو گا۔

اس دور میں پہلے دور سے اتنی ترقی ضرور نظر آتی ہے کہ فارسی کا اسلوب بیان اختیار کرنے کی وجہ سے اردو اسلوب بیان میں بھی وسعت پیدا ہو جائی ہے، نئے الفاظ جو عربی و فارسی سے مستعار لئے گئے اُن سے اردو کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ ہوا یہ بھی زبان کی ترقی میں ایک بڑا مرحلہ تھا، اسی نے زبان کو اس قابل کیا کہ روز مرہ کی بول چال اور عام گفتگو یا سیدھے سادے نہیں مسائل و احکامات کی تصنیف سے گذر کر تخلی اور زیادہ وسیع مباحثت کے انہار کا ذریعہ بن سکے۔

فارسیت کے اس اثر کا سبب یہ تھا کہ دربار کی زبان اب بھی فارسی تھی، مسلمان شرفاء فارسی میں ہی تایلیف و تصنیف کیا کرتے تھے جن بزرگوں نے اردو کی طرف توجہ کی وہ بھی اپنی فارسی دانی کا انہصار کر کے اپنا وقار قائم رکھنا چاہتے تھے، جس کی عبارت ضمنی زیادہ دقیق اور پچیدہ ہوتی اتنا ہی اُس کی علمیت کا اعتذار کیا جاتا۔

فورٹ ولیم کا لج کی نشر

آزاد نے آب حیات میں اپنے مشہور اور مخصوص انداز میں فورٹ ولیم کا لج کا احسان اردو زبان پر رقم کیا ہے، اس کا لج کا قیام اولگا صرف سیاسی ضرورتوں کی بناء پر عمل میں آیا تھا اور اس کا مقصد انگریز بہمندوستانی زبان اور ہندوستانی ہنستی سے آشنا کرانا تھا۔

کے معلوم تھا کہ ہندوستانی زبان کی سرپرستی کے پردے میں انگریز فورٹ ولیم کا لج میں بیٹھے ایک ہبایت خطرناک مناقشہ کی بنیا دُال رہی ہے، اردو ہندی کا مسئلہ جو آج ہندو مسلم بن کرہ لگا ہے اور جو ہندوستان کی قسمت کے فیصلہ میں بہت کچھ زنگ دکھا کر رہا گا۔ اس دن کی یادگار ہے جب فورٹ ولیم کا لج والوں نے اردو اور ہندی سرپرستی کے نام سے دو شعبے اردو اور ہندی کے علیحدہ علیحدہ فورٹ ولیم کا لج میں کھوئے ایک کو مسلمان کے سرڈالا اور دوسرے کو ہندوؤں کے سرمنڈھا، مسلمانوں کو یقین دلایا کہ اردو تھماری زبان ہے تم اس کے محافظت اور ذمہ دار ہو اور ہندوؤں کو سکھایا کہ ہندی کی محنت کے لئے تیار ہو جائیں۔

اُس وقت تشویق میں مسلمانوں نے اردو اور ہندوؤں نے ہندی کو قبول کر لیا اور کسی نے نہ سوچا کہ اس کا انجام بڑا حسرت ناک ہو گا، زبانوں میں مذہبی رنگ پیدا کر کے نفاق اور نفرت کا جو تبع فورٹ ولیم کا لج میں بیوایگی آج پودے کی حد سے گزر کر تنا و درخت بن چکا ہے اس نے اس زبان کو جو قدرتی طور پر ہندو مسلمانوں کے باہمی ربط و ارتباٹ سے بن اور سنور رہی تھی اور ملک کی عام اور متفقہ زبان ہونے کی اہل اور دعویٰ دار تھی ایک فرقہ وارانہ زبان قرار دیکر اس ملک کو ایک واحد ملکی زبان سے محروم کر دیا اگر فورٹ ولیم کا لج نے اردو اور ہندی کو فرقہ وارانہ زبانیں نہ قرار دیا ہو تو اُس کی خدمات ہمیشہ مور دخیل و آفرین رہتیں کیونکہ فورٹ ولیم کا لج نے زبان اردو کی ترقی میں جو کوشش کی وہ اُس راہ کی ابتداء تھی جس پر سر سید اردو کو ڈالنا چاہتے تھے۔

فورٹ ولیم کا لمح کے قائم کرنے والے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے انگریز تھے جو ہندوستانی زبان اور ادب سے نا آشنا تھے، انگریز جو پہلے دن سے ہندوستان کی بگڑی حالت دیکھ کر مغلیہ سلطنت کو دیوبینہ سال مردہ سمجھ چکے تھے اب حکومت کا خواب دیکھ رہے تھے لیکن ملک گیری کے لئے اہل ملک کی زبان ان کی دہنیت اور ان کے رجحانات سے واقفیت حاصل کرنا بھی ضروری تھا اور یہ کام ڈاکٹر گلکر ائمٹ کے پس رہوا، کاش ڈاکٹر گلکر ائمٹ کی نیت خراب نہ ہوتی ورنہ جو خدمات زبان اردو کی انہوں نے انجام دیں وہ اردو کے حق میں اکیر ثابت ہوئیں انہوں نے سب سے پہلے اردو کا اس قسم کا دارالتصنیف قائم کیا جس کی ضرورت اس کے بعد خود اہل زبان کو محسوس ہوئی، جس قسم کا ادبی حلقة سرستید کی کوششوں سے ہندوستان میں پیدا ہوا اسی قسم کا حلقة سب سے پہلے گلکر ائمٹ کی سرپرستی میں قائم ہوا۔

اردو ادب کی زندگی کی تاریخ میں وہ دن بمارک بھی تھا اور منحوس بھی جب فورٹ ولیم کا لمح کی نشری کوششیں شروع ہوئیں ہنخوں تو اس وجہ سے کہ اس نے اس فرقہ دارانہ جنگ کی بنیاد ڈالی جس کا ذکر ہو چکا ہے اور بمارک اس لئے کہ اردو میں جو لصون آمیز اور دقیق زنگ مقبول تھا اس کی جگہ سید حاسادا اور آسان انداز پیدا کرنے کی سعی کی گئی،

انگریزوں کو اردو سے آشنائنا اس ادارہ کا اولین مقصد تھا، اس کام کے لئے ضروری تھا کہ ایسے اصحاب منتخب کئے جائیں جو زبان اردو کے مستند صاحب طرز ہوں اور ہر قسم کی زبان سے واقفیت کمال رکھتے ہوں، دوسرے یہ کہ وہ جس زبان میں تصنیف کریں وہ آسان اور سریع الفہم ہو، یہی اردو جو خود ہندوستان والوں کی سمجھ میں نہ آئے انگریزوں کے لئے اس کا سیکھنا ناممکن بھی تھا اور بیکار بھی چنانچہ فورٹ ولیم کا لمح کی تمام تصانیف بہل اور سادہ زبان میں لکھی گئیں۔

اس دور کے مصنفوں اس دور کے مشہور مصنفوں میں میر آمن، حیدر بخش حیدری، بہادر علی حسینی، **آن کی تصانیف** حفیظ الدین احمد، شیر علی افسوس، ہنال چنڈ لاہوری، اکرم علی، امانت اللہ اور مرزا علی لطف ہیں، یہ سب اردو زبان کے مشہور صاحب طرز اُسٹاد گذرے ہیں۔ ٹانکی تصانیف میں

بانع و پہار، گنج خوبی، طوطا ہمانی، آرایش محفن، گلزار داش، نثر بے نظر، اخلاق ہندی، خرد افروز، بانع اردو، مذہب عشق، ترجمہ اخلاق جلالی اور تذکرہ گلشن ہند، بہت مشہور ہیں، کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ جب فورٹ یونیورسٹی کالج کو اردو نظر لگا کر ضرورت پیش ہوئی تو میر تقی میر کا نام بھی پیش ہوا لیکن بہ سبب پیرانہ سال اُنکو موقع نہ دیا گیا اور ایک جوان جو یقیناً اُن کے مقابلے کے لائق نہ ہو گا اس عہدہ پر مقرر ہوا، یہ اردو ادب کی طرفی قسمتی تھی ورنہ ممکن تھا میر صاحب نظر میں بھی کوئی ایس کارنامہ چھوڑ جاتے جس پر آئندہ نسلیں نازک تریں و پرہنچتیں۔ ان کتابوں میں میر آمن کی تصنیف بانع و پہار حصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے اس کی ابتداء میں میر آمن نے فورٹ یونیورسٹی کا لمحہ کی سرپرستی کا اٹھا کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”صاحبانِ ذیشان کو شوق ہوا کہ اردو کی زبان سے واقف ہو کر ہندوستانیوں کے قلمگو اور گفت و شنید کریں اور ملک کے کام کو با آگاہی تمام انعام دیں اس واسطے لکھنی کتابیں اس سال بوجب فرمائش کے تصنیف ہوئیں“

قصہ کی اصل کے متعلق ان کا قول ہے کہ ابتداءً اس کو حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ نے اپنے پیر و مرشد حضرت محبوب الہی خواجہ نظام الدین اولیا رکو دوران بیماری میں سُنا یا تھا، اُن کی اصل عبارت یہ ہے۔

”جو صبادانا اور ہندوستان کی زبان بولنے والے ہیں اُن کی خدمت میں گذارش کرتا ہوں کہ یہ قصہ چار درویش کا ابتداء میں امیر خسرو نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا اور ریز رنجش جوان کے پیر تھے اور درگاہ اُن کی دل میں قلعہ سے تین کوس لال دروازے کے باہر میا دروازے کے آگے لال بنگلے کے پاس ہے آپ کی طبیعت ماندی ہوئی تب مرشد کامل کے دل کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ یہ ہے کہتے اور بیمار دار یکی خدمت میں حاضر ہتے اللہ نے چند روز میں شفادی تباہیوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصہ کو نے گا خدا کے فضل سے تدرست رہیگا جب سے یہ قصہ فارسی میں مروج ہوا تھا۔“

قصہ کے مأخذ کے متعلق سکوک | عام طور پر اب بھی یہ قصہ حضرت امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے اور

جیسا کہ مذکورہ بالاعبارت سے ظاہر ہے میرامن بھی اس کا سہرا خسرو ہی کے سر رکھتے ہیں لیکن بعض ناقدین کا یہ اعتراض ہے کہ حضرت امیر خسرو نے اپنی تصانیف میں کہیں اس قصہ کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ قصہ میں کہیں اس کی طرف کوئی اشارہ ہے، یہ بھی سمجھو میں نہیں آتا کہ خسرو جیسا خوشگو شاعر حمد میں صفحی کی نظم کیسے درج کرے گا جو فارسی کے نسخے کے شروع میں درج ہے، ہو سکتا ہے کہ قصہ کسی دوسرے کا ہو اور امیر خسرو نے چونکہ حضرت نظام الدین اویمار کو صننا یا تھا اسلئے اُنکی طرف مسوب کر دیا گیا مولوی عبد الحق نے میرامن اور نوطرز مرصع کی عبارات کا جابجا اقتباس پیش کیا ہے، اس سے یہ بات یقین تک یقین جاتی ہے کہ میرامن نے تحسین سے ضرور فائدہ اٹھایا، بعض اوقات تو انہوں نے وہی عبارت اور وہی الفاظ استعمال کئے ہیں جو چیزیں فارسی قصے میں نہیں ملتیں (مثلاً اول درویش کی سیر میں جراح عیسیٰ کا نام) اور نوطرز مرصع میں موجود ہیں وہ باع و بہار میں بھی بخشہ موجود ہیں

ایک فاضل کا یہ خیال ہے کہ یہ قصہ اردو کی کتاب نوطرز مرصع سے اڑایا گیا ہے۔ اس بارے میں سبب تصنیف بیان کرتے ہوئے جو کچھ میرامن نے لکھا ہے وہ بھی قابل غور ہے:-

”اب خداوند نعمت صاحب مرودت نجیبوں کے قدر و ان جان گلگر اسٹ نے کہہ شہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تک گنگا جمنا بہے لطف سے فرمایا کہ اس قصہ کو ٹھیٹھے مہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ مہندو مسلمان عورت مرد لڑکے پالے خاص عام آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کر و مواقف حکم حضور کے میں نے بھی اُسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی بایتیں کرتا ہے“

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ میرامن نے یہ قصہ فارسی سے ترجمہ کیا ورنہ کوئی وجہ معقول نظر نہیں آتی کہ وہ فارسی قصہ کا ذکر کرتے ہیں اور اردو نوطرز مرصع کا نام نہیں لیتے، نوطرز مرصع کی تصنیف ہے، اس کے مصنف میر محمد حسین عطا تحسین اٹاوی ہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میرامن نے جہاں کہیں فارسی قصے سے اختلاف کیا ہے وہاں اُن کا بیان نوطرز مرصع سے بہت متوجہ تھا، لیکن جہاں تک طرز الشارکا تعلق ہے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، میر محمد حسین عطا تحسین

نے پرانی روشن کے مطابق اور متقدہ اور بسیح نثر لکھی ہے میرا من اس تکلف سے بری ہیں۔

باغ و بہار کی طرز اُنٹا تو میرا من کا قول ہے کہ

اور ہمیں اُن کے اس قول سے پورا پورااتفاق ہے، باغ و بہار کے صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے لیکن کہیں تکلف اور آور دکانشان نہیں ملتا ہر جگہ معلوم ہوتا ہے کہ فقرے مصنف پر نازل ہوئے اور قلم سے پُک پڑے۔ اس میں لکھنے والے نے اپنی طبیعت پر زور ڈال کر کچھ بھی نہیں لکھا ہے، اس کی فصاحت اور بلاعنت بے پناہ ہے اور باعتبار زبان اسے اُس وقت کی نہایت پیشہ اُردو سمجھنا چاہیے۔ اسے میرا من معیاری اُردو سمجھتے ہیں۔

”اب نے سر سے زبان کو رونق ہوئی نہیں تو اپنی دستار اور رفتار کو کوئی برا نہیں جانتا اگر ایک گنوار سے پوچھئے تو شہروالے کو نام رکھتا ہے اور اپنے تیس سب سے بہتر سمجھتا ہے، خیر عاقلاں خود می دانند..... بہت ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کے سب سے دل میں گئے اور رہے دہ بھی کہاں تک بول سکیں گے کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں گے اور جو شخص سب آفیں سہ کر دل کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پیشیں اسی شہر میں گذریں اور اس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے عرس چھڑیاں سیر تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی مدت تک کی ہو گئی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہو گا اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے، یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا پہنچا ہے“

میرا من کا یہ قول خود دستائی پر محمول نہیں کرنا چاہیے، وہ دہلی کے رہنے والے تھے اُن کی زبان وہاں کی ٹھیک روزمرہ ہے اور سنند ہے، بقول ایک فضل کے بہی زبان تھوڑے سے فرق سے نذیر احمد کی زبان معلوم ہوتی ہے، ویسے ہی محاورے ضرب الامثال اور جتنے فقرے جو میرا من نے استعمال کئے ہیں نذیر احمد کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔

یہ زبان سوا سو برس پہلے کی زبان کا نمونہ ہے اور آج کی زبان سے کچھ فرق پایا جاتا ہے لیکن پھر جی یہ کتاب اتنی مقبول ہے کہ شاید ہی کوئی اور قصہ کہانی کی کتاب ہو، عورتیں اور بچے بھی اسے دلچسپی سے مزہ لے لیکر

پڑھتے ہیں، اس کا انداز بیان سادہ، عبارت صاف اور بھی ہوئی ہے، فارسی کے جو الفاظ اور ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں وہ اس خوبی سے اُردو میں جڑھی ہیں کہ بذریب ہونے کی وجہ سے ان سے زبان کا حسن رونق اور بھی بڑھ گئی ہے لیکن عربی فارسی کے موٹے موٹے الفاظ اور ترکیبیں ان کی عبارت میں ناپید ہیں، جگہ جگہ مہندی کے الفاظ بڑھی خوبصورتی اور مکال کے ساتھ استعمال کئے ہیں جس سے گلگھمنی کا لطف آ جاتا ہے، باغ و بہار اُردو کی زندہ جاوید کتابوں میں ہے نہ صرف اس لئے کہ یہ اُردو کے نشأۃ الشانیہ کی آنکھیں دار ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس سے بڑھ کر بامحاب اور فصحی زبان میں اب تک کوئی قصہ کہانی تحریر نہیں ہوا، اس کی سادگی میں ہی وہ زیگنی اور شیرینی پہنچا ہے جو بہتر سے بہتر متفقی اور صحن مسجح اور زیگنیں عبارتوں میں بھی نہ ملتے گی۔

جہاں تک انتخاب الفاظ کا تعلق ہے میر امِن نے فصاحت کے ہر ہمپوکو مذکور رکھا ہے، ہر عبارت موقع اور محل کی مناسبت سے ہے، بادشاہ جو کچھ کہتا ہے بادشاہ کے شایانِ شان ہے اور فقیر کا بیان فقیری کی زبان سے معلوم ہوتا ہے۔ ایسی بے عنوانی باغ و بہار میں نہیں ملتی کہ بادشاہ بھکاریوں کا انداز گفتگو اختیار کرے اور گدری پوش فقیر بادشاہوں کی سی زبان استعمال کریں۔

قصے کے سلسلے میں جن اداب و رسوم کا ذکر آگیا ہے وہ ہندوستان کی اس عہد کی معاشرت کی اچھی تصویریں ہیں، مثلًاً ایک موقع پر ایک تقریب کی تیاری کا ذکر کرتے ہیں۔

”دیکھا تو تمام حوالی میں فرش مکلفت لا یق ہر مکان کے چا بجا بچھا ہے اور مسندیں لگی ہیں پانداں، گلاب پاش، عطر داں، پیکداں، چنگیز-قریتے سے دھرے ہیں طاقوں پر زنگرتے، کوبے، نارنگیاں، اور گلابیاں زنگ زنگ کی چنی ہیں، ایک طرف زنگ آیمز ابرک کی ٹیوں میں چراغاں کی پہار ہے ایک طرف جھاڑا اور سروکنوں کے روشن ہیں اور تمام دالاں اور شہنشہینوں میں طلاقی شمعدانوں پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں اور جڑا اوفانوں اور دھری ہیں سب آدمی اپنے اپنے عہدوں پر مستعد ہیں باور چینا نے میں دیگریں کہنک رہی ہیں، آبدار خانہ میں بھی ولیسی ہی تیاری ہے کوری کوری ٹھلیاں روپے کی گڑ و نچیوں پر صافیوں سے بندھی اور بوچروں سے ڈھکی رکھی ہیں، آگے چوکی پر ڈونگے کٹورے بمعہ تھالی سرپوش دھرے اور برف کے آبخوارے لگ رہے ہیں اور شورے گی صراحیاں

ہل رہی ہیں، غرض سب اسباب بادشاہانہ موجود ہے کنچنیاں، بھانڈ، بہمکت، کلانوت قول اچھی اچھی پوشائیں
پہنے اپنے سازوں کے سر ملائے حاضر ہیں۔“

اس کو پڑھئے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مغل بادشاہ یا شاہزادہ کی کسی مخفی طب میں پہنچ گئے، الفاظ میں ایسا
نقشہ کھینچا ہے کہ اصل سماں آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، ایسے بیانات کی مدد سے اُس عمد کی تہذیب و معافیت
کی مکمل تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔

ایسے بیانات کے سلسلہ میں ایک بات اور یاد رکھنے کے قابل ہے یہ سب چیزیں میرامن نے جیسا کہ خود کہا
ہے دہلی میں بادشاہوں، امراء اور ریسوس کی مخلوقوں میں دیکھیں اور یہ خاص مشرقی زنگ تھا جو صرف ہندوستان
میں مخلوقوں کے دربار میں نظر آسکتا تھا، میرامن نے ایسی منقولہ بالائقشہ کو مبنی کے شاہزادے اور ملک شام کی
شہزادی کے قصہ میں دکھایا ہے، یہ ولیسی ہی مثال ہے جیسے اپنے مرثیوں میں واقعات تو حضرت امام حسین
اور شہزاد اور کربلا کے بیان کئے ہیں اور شادی بیاد اور ماتم و نوصد کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ غالباً ہندوستان بلکہ
لکھنؤ کا مخصوص حصہ ہے، اس کا سبب معلوم کرنا مشکل نہیں، لقول رابندرناٹھ میگور پہلے زمانے کے قصہ پڑھنے والے اس
مقیدی نظر سے قصہ کہانی نہیں دیکھتے تھے جس سے ہم دیکھنے کے عادی ہیں اُن کے نزدیک کوئی بادشاہ اس نام
کا تھا یا اس نام کا وہ اس ملک میں تھا یہ اس ملک میں ان کا اثر قصہ پر کچھ نہیں پڑتا تھا جب تک قصہ میں دیکھی
کا کوئی سامان تھا قصہ کامیاب تھا لہذا یہی قصہ گوؤں کا طرز تھا کہ وہ دیکھی پی کے علاوہ قصہ میں کسی اور اصول کا
لحاظ نہیں کرتے تھے۔

میرامن کا ایک اور کمال منظر کشی ہے، جس کی چیز کو عصر حاضر کے اردو ناول نگاروں نے ترقی دی
اُس کی ابتداء میرامن سے کرنی چاہیے، لقول آزاد اردو والے جب بانع کی بہار کا ذکر کرتے ہیں تو سب کچھ
بیان کر جاتے ہیں لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس دنیا کا بانع ہے اور یہی بہار، میرامن نے اس موقع پر
اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:-

”ایک روز بہار کے موسم میں مکان بھی دیکھ پ تھا بدل گھنٹہ رہی تھی بوندیاں پڑھی تھیں بھلی بھی کوندرہی

تحی اور ہوانر مزرم آئی تھی غرض عجیب کیفیت ادم تھی جوں ہی رنگ بزنگ کے جباب اور گلاب کی گلابیاں طاقوں پر چپی ہوئیں نظر آئیں دل لچایا کہ ایک گھونٹ پی لوں، جب دو تین پیالوں کی نوبت پہنچی وہیں مجھکو خیال ہوا کہ اس بانع نو خرید کو دیکھوں، کمال شوق سے بانع کی سیر کرنی چاہی کمختی جوآوے اونٹ چڑھے کتا کاٹے اُھکر بانع کی طرف چلی دیکھا تو یہیک اس بانع کی بہار بہشت کا مقابلہ کر رہی تھی، قطرے مینہ کے جو درختوں کے پتوں پر پڑے ہیں گویا زمرد کی پڑیوں پر موئی جرٹے ہیں اور سُرخی پھولوں کی اس شفق میں الیسی ہے جیسی شام کوشف قہوہ لی ہے اور نہریں لبالب مانند فرش آئینہ کے نظر آتی ہیں اور موجیں لہراتی ہیں۔۔۔۔۔ یہ روشنی کاٹھاٹھ لھف کر جا بجا قلمقہ سروچرا غال، کنوں فالوس خیال، شمع مجلس حیرالن اور فالوسیں روشن تھیں کہ شب برات با وجود چاندنی اور چرا غال کے اس کے آگے اندر ہیری لکھتی تھی ایک طرف اتسازی چھٹتی تھی، اسی عرصہ میں بادل بھٹ گیا اور چاندنیکل آیا یعنیہ جیسے نافرمانی جوڑا پہنے کوئی معشوق نظر آتا ہے۔“ میرامن کا ایک اور کمال محاورہ بندی ہے جو ان کے بعد صرف نذرِ احمد میں کامیابی کے ساتھ ملتا ہے، میرامن نے جو محاورے استعمال کئے ہیں وہ آج بھی کم و بیش فیض سمجھے جاتے ہیں لیکن میرامن کا کمال یہ ہے کہ محاورہ بندی کے سلسلہ میں یہ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی محاورہ انہوں نے قصد ایسا بھرتی کے خیال سے رکھ دیا ہے، مثلاً

۱۔ ”کمال شوق سے بانع کی سیر کرنی چاہی کمختی جوآوے اونٹ چڑھے کتا کاٹے اُھکر بانع کی طرف چلی“

۲۔ ”وہ نگوڑا جو کچھ کہتا گیا میں مانتی گئی اب یہ ناتھ نچایا کہ مجھکو کوئی پڑے گی۔

۳۔ ”میری اس وقت یہ حالت تھی کہ اوسرچو کی ڈومنی گاوے تال بے تال۔

۴۔ ”میرے سر سے پانوں تک آگ لگ گئی اور انگاروں پر لوٹنے لگی اور غصہ میں یہ کہاوت کی بیل نہ کو دے کو دے کون یہ تاش دیکھے کون اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہندی کبیس بھی بڑی خوبصورتی سے بر موقع استعمال کی ہے۔

جب دانت نہ تھے تب دو دھدیا جب دانت دئے کیا ان نہ دے ہے
ہے جو جل میں منجھی بس میں سدھ میت سوتیری بھی لے ہے
کا ہے کو سوچ کرے من مور کھ سوچ کے کچھ ہاتھ نہ آئے
جان کو دیت ان جان کو دیت سو تو کو بھی دیسے ہے!

میر آمن کی ایک خاص خصوصیت جوان کو اردو کے بہت سے مشہور نثر لگاروں سے ممتاز کرتی ہے ان کے چھوٹے جملے استعمال کرنے کی عادت ہے، پوری عبارت میں بڑے بڑے جملے بہت کم نظر آتے ہیں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں چھوٹے چھوٹے جملوں میں بغیر حرف ربط کے استعمال کئے ہوئے کہہ جاتے ہیں مثلاً ”راسی طرح تین دن رات صاف گزر گئے، ملکہ کے منہ میں ایک کھیل اڑ کر نہیں گئی، وہ چھوٹے سا بدن سوکھ کر کاٹا ہو گیا اور کندن سا دمکتا ہوا زمگ ہلدی سابن گیا منہ میں پھر ٹھی بندھ گئی آنکھیں پھرا گئیں مگر ایک دم اُمک رہا تھا کہ وہ آتا جاتا تھا۔“

عام مذاق کا اثر یہ تھا کہ میر آمن بھی کہیں کہیں متفقی عبارت سے محفوظ نہ رہ سکے لیکن ان کی یہ قافیہ بندی صرف افعال تک محدود ہے اور وہ بھی تصنیع اور آور د معلوم نہیں ہوتی مثلاً قطرے یہ کے جود رختوں کے پتوں پر پڑے ہیں گویا زمرد کی پڑیوں پر موٹی جرطے ہیں اور پھر ان لبالب مانند فرش آئینہ کے نظر آتی ہیں اور موجودیں لہراتی ہیں۔

میر آمن اردو زبان | میر آمن نے سب سے پہلے اردو زبان کی تاریخ بیان کرنے کی کوشش کیے مورخ کی چیخت سے کی:-

”حقیقت اردو زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوگی ہے انھیں کے راجا پر جا قدیم سے رہتے تھے اور اپنی اپنی بھا کا بولتے تھے، اہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا، سلطان محمود غزنوی آیا پھر غوری اور بودی بادشاہ ہوئے اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمانوں کی آمیزش پائی، آخر امیر تمور نے جن کے گھرانے میں اب تک نام نہاد سلطنت کا پلا آتا ہے“

ہندوستان کو لیا، ان کے آنے اور رہنے ہئے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا اس داسٹے شہر کا بازار اُردو کھلایا پھر ہمایوں بادشاہ پُھانوں کے ہاتھ سے چران ہو کر ولایت گئے آخر وہاں سے آکر اس مادہ پُھانوں کو گوشمالی دی کوئی مفسد باقی نہ رہا کہ فتنہ و فساد برپا کرے، جب اکبر بادشاہ تخت پر نصیحت تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی شنکر آکر حضور میں جمع ہوئی، لیکن ہر ایک کی گویائی اور بول جدی جدی تھی اکٹھنے ہونے سے اپس میں لین دین سو دا سلف سوال جواب کرتے کرتے ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی جب حضرت شاہ بھیاں صاحب قرآن نے قلعہ اور جامع مسجد اور شہر بنیاہ تعمیر کروایا اور تخت طاؤس میں جواہر جڑوا یا اور دل بادل ساختمہ چوبوں پرستادہ کر کے طنابوں سے پھوایا اور نواب علی مردان خاں ہنر کو لیکر آیا تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنادار الخلافہ بنایا تب سے شاہ بھیاں آباد مشہور ہوا اگرچہ دلی جدی ہے وہ پرانا شہر کھلاتا ہے اور یہ نیا شہر ہے اور وہاں کے بازار کو اُردو یہ معلم خطاب دیا.....

کم و بیش یہی نظریہ آب حیات کے لکھنے وقت مولانا آزاد کے پیش نظر تھا۔

میراًمن نے اُردوزبان کی تاریخ کے سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ ان کو روایتاً اپنے بزرگوں سے پہونچا تھا لیکن بھرپوری اُس عہد کی تحقیق کے معیار سے میراًمن کا بیان بحد قابل قدر ہے۔

فُورٹ ولیم کالج کی دیگر تصانیف میں حیدر بخش حیدری کی طوطا کہانی بھی بجد مقبول ہوئی لیکن یہ میراًمن کی عبارت کا مقابلہ نہیں کر سکتی، حیدر بخش حیدری کا اسلوب بیان سنجدہ اور پھلے دور کے مصنفین سے نسبتاً سلسلہ ہوا ہے لیکن ان کے جملے بڑے بڑے ہیں عربی فارسی کے الفاظ اور تراجم کا استعمال بھی انہوں نے بکثرت کیا ہے، علاوہ بریں محاوروں کے استعمال میں انہوں نے خاص کوشش نہیں کی ہے، ان تمام باتوں کے پیش نظر باغ و بہار ہی اس عہد کی بہترین تصنیف قرار پاتی ہے فورٹ ولیم کالج کی شرکی خصوصیات فورٹ ولیم کالج کی ادبی تحریک اُردوزبان کے نشانہ الثانیہ کی

ابتداء ہے اگر اس وقت میرامن والا طرز مقبول ہو جاتا تو اردو میں جو پیزش کی جنگ آزادی کے بعد پیدا ہوئی اس سے پہلے ہی پیدا ہو جاتی، اردو میں اہل ملک نے اپنے مذاق کے مطابق جس قسم کا تضیح پیدا کر لیا تھا اس کا ذکر سابقہ دور کی خصوصیات کے سلسلہ میں ہو چکا ہے، فورٹ ولیم کا بح کی تحریک نے اس بگڑے مذاق کو سدھارنے کی کوشش کی اگرچہ ملک کی ذہنیت اور انشا پردازوں کا انداز سرستید کی ادبی تحریکات کے بعد ہی بدی یہ لیکن اس کی ابتداء گلکار انسٹ کے علاقہ سے ہوئی، ان کی اردو صاف سادہ سلیس با محاورہ اور عربی فارسی کے ٹیکل الفاظ سے پاک صاف تھی اور یہ ایسی راہ تھی جس میں بہت کچھ ترقی کے امکانات نظر آتے تھے۔

۲۵ء اور اس کے فریبی زمانہ

میں اردو شرکی حالت

۲۵ء اور اس کے فریبی زمانہ کو اردو زبان کے قدیم دور اور نشاۃ الثانیہ کے درمیان ایک طرح کا عبوری دور کہنا چاہیے یعنی زبان میں ایک خاص قسم کی تبدیلی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے لیکن عام مذاق اب بھی پرانے طرز کو پسند کرتا تھا اور اس قسم کی سادگی کو انسان کے فہم کا قصور کہتا تھا، فورٹ ولیم کا بح نے اتنا تو ضرور کیا تھا کہ دو چار کتابیں روزمرہ اور با محاورہ زبان میں تصنیف کرادی تھیں لیکن عام ذہنیت کو تبدیل کرنا ان لوگوں کا کام نہ تھا یہ زمانہ خصوصیت کے ساتھ ایسا تھا جب ہندوستان والے انگریزوں کے افعال اور اقوال پر شک کرنے لگے تھے اور اسی شک کا نتیجہ ۲۵ء کے تونیں واقعہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔

لکھنؤ والے خصوصیت کے ساتھ قدیم مذاق کو پسند کرتے تھے اور اس میں اُن کا قصور نہیں، دلی اُجر طریقی تھی، اہل ہنر پریشان ہو کر عافیت کی تلاش میں دلی اور دلی والوں کو چھوڑ چھوڑ کر کسی اور کا

سایہ تلاش کر رہے تھے، اس دقت فیض آباد اور لکھنؤ کی قسمت جاگ آٹھی مغلوں کے دربار سے جوموتی نکلے شاہان اودھ کے دامن میں آسمائے یہاں علم و فن کی قدر تھی اور اس وقت بہتی گنگا کی طرح پچھے ایسی کشش تھی کہ جس نے منادی کو چھوڑا اور لکھنؤ اسایا اور اس طرح مشرقی ہندیب کا آخری نمونہ اودھ کے اس اجڑے دربار نے دیکھا یہاں وہ سب موجود تھے جنہوں نے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں اور جو وضع دار ایسے تھے کہ پرانی لکر کے فقیر بننے کو ہی سرمایہ افتخار جانتے۔

چنانچہ زبان میں بھی یہاں جدید زنگ ذرا دیر سے پیدا ہوا، مزادر جب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب میں وہی پرانی متفقی مسحح اور زمین عمارت لکھی ہے جو پچھلے دور کی طریقہ امتیاز رہی تھی اور نئے طرز کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھا:-

”دل کے روڑے ہیں کہ محاوروں کے ہاتھ پانوں توڑے ہیں، تپھر پڑیں ایسی سمجھ پر کہ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے“

لکھنؤ سے قطع نظر خود دلی والے پرانی وضع داری کو بناہ رہے تھے، امام نخش صہبائی وغیرہ سب اسی زنگ میں متلا تھے پھر بھی دلی نے لکھنؤ سے پہنچ کر وٹ لی اور ۱۹۰۵ کی ہڑبوم کے بعد مولانا غلام اما شہید نے جب انشائے بہار بے خزاں لکھی تو طرز ادا کو ایک حد تک سلیس اور سادہ کر دیا لیکن اس کتاب میں تخیل کو بہت زیادہ دخل تھا۔

اسی زمانہ مولوی سید احمدی بیلوی کی بہبی تحریک شروع ہوئی اور مذہب کی اشاعت اور اپنے عقائد کی تبلیغ کے سلسلہ میں مولوی صاحب موصوف نے جوزبان استعمال کی وہ اسی نئے طرز کی تھی۔

اس دور کی ناینده ہستی اسد اللہ غالب ہے، اردو شاعری میں جو قبول عام غالب کو باوجود اپنی دقت پسندی کے نصیب ہوا کسی اور شاعر کے حقے میں نہیں آیا۔ اپنی جدت پسندی، نزاکت خیال، فلسفہ اور تصور سے انہوں نے اردو غزل میں ایک مستقل زنگ کی بنیاد ڈالی، غزل اور غزل کا مفہوم صرف واردات حسن و عشق کے نظم کرنے تک محدود تھا غالب نے اسی زنگ میدان میں جو وسعت پیدا کی اس کی کسی کو امید بھی نہ تھی، انہی نئی تکیں

نازک تشبیہیں اور دلنشیں استعارات اُن کی جدت پسند طبیعت نے ایسے لکائے کہ انداز شاعری میں ایک انقلاب کی ابتداء ثابت تھی۔

غالب اور اردو نشر انظم کے ساتھ ساتھ اردو نشر بھی غالب کی کم احسان مند نہیں، اردو یے معلیٰ جو اُن کے خطوط کا مجموعہ ہے اردو ادب میں اپنی آپ مثال ہے، اردو کو سیدھے سادے طرز سے آشنا کرانا فورٹ ولیم کالج والوں کا کام تھا لیکن ملک میں اُس طرز کو مقبول کرانا غالب کی قسمت میں تھا، اُن کے زمانہ میں ہی اُن کے ہم عصر اُن کے طرز پر فرضیت تھے اور اُن کے بعد اُن کے ان خطوط انے ان کی جگہ اردو نشر کی تاریخ میں بید بلند کر دی۔

حال میں چند بزرگوں نے اردو یے معلیٰ اور عودہ نہیں کی دیکھا دیکھی اپنے مکاتیب کے مجموعے شایع کرانا شروع کر دئے ہیں لیکن یہ آفتاب کو چرانغ دکھانا ہی ہو کر رہ گیا، اُن پر فوقيت تو در کارکسی کو اُن کے برابر پہنچنا بھی نصیب نہیں ہوا۔

اُس وقت خطوط میں آداب اور القاب جو لوازمہ خط بن گئے تھے محض رسمی طور پر لمبے چھوڑے لکھے جاتے اور غیر ضروری باتیں اصل مطلب سے کہیں زیادہ خط میں موجود ہوتیں غالب نے جو ہر چیز میں جدت کے طالب تھے اور جن کی غیور طبیعت کسی حیز میں اتباع اور پریروی پسند نہیں کر سکتی تھی اپنے لئے ایک نیا راستہ تلاش کیا انہوں نے مکاتیب کو مکالمہ بنایا اور اُس میں ایسے کامیاب ہوئے کہ الفاظ میں ملاقات کا سازہ پیدا کر دیا یہی اُن کے تمام خطوط کا خاص انداز ہیں کہیں صرف بھائی یا میاں کہ کر خط شروع کیا اور رسمی القاب اداب چھوڑ کر فوراً اداۓ مطلب پر آگئے کہیں میاں میر مہدی بحروف سے ملاقات کا نقشہ کھینچا اور دلکش انداز میں سب کچھ ادا کر گئے۔

جہاں تک عبارت کا تعلق ہے ہر قسم کے لایعنی تکلفات سے پاک اور بری ہے مشلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:-

”صاحب تم خط کے نہ بھینے سے گھر رہے ہو گے حال یہ ہے کہ قلم بنانے میں میرا ہاتھ انگوٹھے کے پاس ہی

زخمی ہو گیا اور ورم کر آیا، چاروں روٹی بھی مشکل سے کھانی گئی ہے۔
یا ایک اور مقام پر لکھتے ہیں۔

”بھائی یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے خیر دیرے لکھو اگر شتاب نہیں لکھتے“ ان کے طرز کی ایک اور خصوصیت ان کی شوخی اور ظرافت ہے جگہ جگہ ایسی چنکیاں ہیں کہ پڑھنے والے کو لطف آ جاتا ہے مثلاً

”تیری جان کی قسم مجھکواں وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوس ت مالع کی تاثیر تھی میرا مدد و حجتیا نہیں،
نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دئے، واحد علی شاہ یتن قصیدوں کے تحمل ہوئے
پھر نہ سنبھل سکے، جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا، ناصاحب دُ ہائی خدا
کی میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا“
اُن کے طرز کی میساختگی ذیل کے خط سے ظاہر ہے:-

”پیر و مرشد ۱۲ بجے تھے میں نگا اپنے پنڈگ پر میٹھا ہوا حلقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا، میں نے
کھولا ڈھا، بھلے کو انگر کھا کرتے گئے میں نہ تھا اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا، حضرت کا کیا جاتا میر القصمان ہوتا“
یا میر عہدی مجروح کو خط لکھتے ہیں۔

”اے جناب میرن صاحب، السلام علیکم، حضرت ادب، کہو صاحب آج اجازت ہے میر عہدی
کے خط کا جواب لکھنے کی، حضور میں کیا منع کرتا ہوں، میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے
ہیں بنجارتا رہا ہے صرف پیش باقی ہے وہ بھی رفع ہو جائے گی، میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے
دعا لکھ دیتا ہوں پھر آپ کیوں تکلیف کریں، نہیں میرن صاحب کے خط کو ائے ہوئے بہت دن ہوئے
ہیں وہ خفا ہوتا ہو گا جواب لکھنا ضرور ہے“

خط نہ لکھنے کی معدودت کو کس اچھوتے اور نرا لے انداز میں پیش کیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ رَقْعَاتِ عَالَبَ

ا۔ مہر نیم روز، کی تالیف کے دوران (لعنی نسخہ ۱۸۵۶ء) میں اردو رقعے لکھنا شروع ہوئے کیونکہ فارسی رقعات بڑی محنت سے تیار کرتے تھے اور اردو کو قلم بینھاں کر اور جی لگا کر نہیں لکھا۔

۲۔ رقعات کی سوانحی اہمیت۔

۳۔ رقعات کی تاریخی اہمیت۔

۴۔ ادبی اہمیت۔ (۱) رقعہ نویسی میں ر(۲) نثر کے جدید طرز میں۔

۵۔ شفیق ان کو خطوط اک اشاعت کا گمان نہ تھا، اس سال ان کے شاگردوں نے اس خیال کو ظاہر کیا اس کے بعد ان کو شاید یہ خیال رہتا ہوا انہوں نے خود اپنے خط جمع کے انداز بیان بھی بھی کہتا ہے، دو جمیع انبی وفات کے بہت جلد بعد شائع ہوئے جو ان کی نظر سے گذر چکے تھے۔

اُردو ادب کا نشاہِ الثانیہ۔ دو رجید کی ابتداء

سرسید اور ان کے ادبی رقصاء

حَالِيَّ شَكْلِيَّ، نَذِيرًا حَمْدَ، ذُكَارَ اللّٰهِ

۱۸۵۶ء میں ہندوستان کے منظلوں نے اس صاقبت کا الہمار کیا جسے انگریزی مورخ خدر اور بغاوت کے ذلیل نام سے پکارتے ہیں اور آزادی وطن کے متوا لے جسے جنگ آزادی میں ایک ناکام کوشش قرار دیتے ہیں اس کے ابباب اور تواریخ سے بحث کرنے کی یہاں ضرورت نہیں ہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ فوری نتیجہ اس ہنگامہ کا کچھ اچھا نہیں ہوا اور ایک حد تک ہمارا شیرازہ منتشر ہو گیا، مغلیہ سلطنت جو عرصہ سے موت کی گھڑیاں

گن رہی تھی ایک ہچکی لیکر خصت ہوئی اور اس کا رہاہمانشان مٹتے ہی ہمارے تدن کی بنیاد بیں ہل گئیں۔ ادھر تمیوری جلال و جبروت کی شمع آخری مرتبہ جھبلدا کر خاموش ہو گئی ادھر مسلمان بے کسی اور بے بسی کے عالم میں ایک دوسرے کا مُمنہ تکتے رہ گئے، کسی کی سمجھ میں بھی نہ آیا کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا کیا اُمید تھی اور کیا ہلو میں آیا، پھر جو ہڑوبنگ مجھی تو ایسی کہ الشردے اور بندھے لائکھوں بد امنی میں مارے گئے، ہزاروں امن میں بھانسی پر لٹکائے گئے جس کو جہاں جگہ ملی وہیں پناہ لی نفس افسی کا یہ عالم تھا کہ کسی کو خبر بھی نہ تھی کہ دوسروں پر کیا گذر تی ہے سب اپنی اپنی خیر منار ہے تھے۔

اس کا اثر ادب اور زبان پر بھی ہوا، شاعری میں فتویٰ طیت کا زنگ بیج دنایاں ہو گیا اور شعر گویا شاعر کے دکھے دل کی پکار بن گیا اور نثر نگاروں نے جب دنیا میں کسی چیز کو قابل التفات نہ پایا تو خیال جنت کے تھوّر میں مست رہنے لگے، غرض ہر شخص کی دنیا زالی تھی، جہاں کہیں سلگتگی اور زنگینی پیدا تھی وہاں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا کوئی مصیبت زدہ کھسیانی ہنس رہا ہے یعنی محض بناوٹی اور تصنیع آمیز۔

اس اڑے وقت پرسر سید نے بڑی ہمت کی، سر سید ان لوگوں میں تھے جو وقتی ہڑوبنگ کی بجائے ٹھوس کام کو زیادہ مضید سمجھتے تھے آن کے دل میں قوم و ملت کا درود تھا، مسلمانوں کی بداقبالی پر وہ گھنٹوں آنسو بہاتے تھے لیکن جذبات سے زیادہ ان میں عمل کی قوت تھی وہ قوم کے سامنے ایسا لایکہ عمل پیش کرنا چاہتے تھے جو اس دیرینہ سال مردے کے حق میں مسیحائی کر سکے، اس لایکہ عمل میں زبان و ادب کی ترقی بھی شامل تھی کیونکہ زبان ہی سماج اور معاشرت کی بنیاد ہے۔

سر سید کی پیدائش دہلی میں ہوئی اور دہلی کو ہر حیثیت سے مرکزی اور تاریخی اہمیت حاصل تھی اجڑ جانے پر بھی دلی میں وہ شان باقی تھی جو دوسرے شہروں کو آبادی اور رونق کے زمانہ میں حاصل ہوتی ہے، وصنعتدار مٹتے چارہ ہے تھے مگر دلی کی گلیوں کی محنت نہ نکلنا تھی نہ لکلی اس اجڑے حال پر بھی غالب، ہبہائی اور انگشتی شعراً و ادیب اس چمن میں موجود تھے سر سید کو آنکھ کھول کر ان کی تربیت نصیب ہوئی۔

ابتداء میں سرستید نے چند چھوٹے رسائلے مذہب اور ریاضی پر تحریر کئے یہ دونوں چیزیں سرستید کی خاندانی تھیں اسی زمانہ میں شعر شاعری سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور ابتدائی کارنامہ ایک مشنوی ہے جو آج معروف ہے، علامہ شبیل نے اس مشنوی کا ایک مصروعہ نقل کیا ہے ۔

نام میرا تھا کام آن کا تھا

اس زمانہ میں آن کا تخلص آہی تھا۔

اُردو زبان کی خوش قسمتی تھی کہ سرستید کا دل بہت جلد شعروonthاعری سے ہٹ گیا اور وہ نظر ک طرف متوجہ ہوئے، نظر کا اس وقت جو حال تھا مذکور ہو چکا ہے زمین اور پرکلفت عبارت جس میں قافیوں اور ردیقوں کا التزام ہوا اور جوئی نئی ترکیبوں، دوراز کار استعارات و شبیهات سے مملو ہو عام طور مقبول تھی سرستید پر جن لوگوں کا اثر ہو سکتا تھا لامولانا صہبائی آزردہ وغیرہ وغیرہ سب خود پرانے طرز کے ولادوں تھے چنانچہ سرستید کی انہیں اسی اندازے ہوئی۔

۱۸۲۷ء میں انہوں نے آثار الصنا دید مرتب کی، اس میں دہلی کی محضصر تاریخ اور وہاں کی عمارتوں کا مفصل حال درج ہے اس کے ساتھ ہی بعض مفید تصویریں لقشے اور کتنے بھی شامل ہیں۔

کتاب لکھتے وقت سرستید کے سامنے میرامن کی بانع وہار کا نمونہ موجود تھا اور ظاہر ہے کہ پرکلفت اور زمین عبارت کے مقابلہ میں یہ نیا طرز الشاہزاد تاریخی مباحثت کے لئے زیادہ موزوں اور مندرجہ تھا لیکن سرستید صہبائی کا تبع کرتے تھے اور صہبائی اُردو نشر میں بیدل اور ظہوری کازنگ دیکھنا چاہتے تھے لہذا آثار الصنا دید میں وہی طرز عبارت اختیار کیا گیا سرستید نے شبیل سے بیان کیا کہ اس کتاب کے بعض مقامات صہبائی نے خود اپنے قلم سے تحریر کر دئے تھے لہذا اچھا کہیں زور انشاد کھایا گیا ہے بیدل اور ظہوری کازنگ پیدا ہو گیا ہے مثلاً:-

”آن حضرت کی طبع رسائلہ سلطنتی رابعہ سے پہلے اس سے نتیجہ حاصل کرنی ہے کہ بدیہی الانسانح سے ارباب فہم و ذکار اور ناخن فکر عقدہ لا یحتج کو پہلے اس سے واکرتا ہے کہ گرہ جبابد کو انگشت موح دریائے

معنی فہمی اس درجہ کہ راست و درست سمجھ لیا کہ زبان سو سن نے کیا کہا اور مردم شناسی اس مرتبہ کو واقعی معلوم ہو گیا کہ نرگس نے کیا اشارہ کیا اگر ان کی رائے روشن معجزہ نما ہو تو نقطہ موہوم کو انگشت سے تقسیم کرے اور جزو لا یتھری کو دونیم۔

اُردو عدالتی زبان ۱۸۳۲ء میں اردو نشر میں ایک بڑا انقلاب رونما ہوا، اسی سال اردو زبان عدالتی اور دفتری زبان قرار پائی اور ظاہر ہے کہ جب کسی زبان کو حکومت کی سرپرستی مل جاتی ہے تو اس کی ترقی کے امکانات بسید و سمعہ بر جاتے ہیں، سرکاری زبان ہوتے ہی اردو کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہوا اور وہ مصطلحات قانونی جوانح تک انگریزی اور فارسی قانون کی کتابوں میں موجود تھے اردو میں ترجمہ ہونے لگیں اور اس طرح اردو زبان میں قانونی الفاظ کی بڑی تعداد پڑھ گئی۔

سرکاری مدارس اسی زمانہ میں سرکاری مدارس کے لئے اکثر کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ اور اردو کتابیں ہوئیں، نئی کتابوں کے ترجموں کے سلسلہ میں دہلی کالج کا نام ہمیشہ زندہ رہیا گا، یہ کتابیں چونکہ خاص علمی مباحث سے متعلق تھیں اور ترجمہ کے ساتھ ہی اسلوب بیان کا آنا بھی ضروری ہے (جیسا کہ اردو نشر کے دوسرے دور میں فارسی سے ترجموں کے ساتھ ہی ساتھ فارسی اسلوب بیان بھی اردو میں رواں ہو گیا) لہذا انگریزی الفاظ کے ترجمے کے ساتھ انگریزی اسلوب بیان بھی اختیار کیا جائے لگا، اس سے زبان میں بیساختگی اور سادگی پیدا ہو گئی۔

پریس اور اردو کے اس نشأۃ الثانیہ میں پریس کے قیام کو بھی کافی دخل ہے اردو میں بہ اردو کی ترقی سے پہلے لو ہے کا چھاپہ فورٹ ولیم کالج والوں کی طرف سے روشناس کرایا گیا ڈاکٹر گلکار است کی قواعد اردو کا ایک نسخہ جو اردو کے اس اولین پریس میں طبع ہوا میرے پاس محفوظ ہر میرا من کی بانغ و بہار اور فورٹ ولیم کالج کے دوسرے مصنفین کی کتابیں اسی پریس سے شائع ہوئیں۔ لیکن لو ہے کا چھاپہ اردو وہ سہم الخط کے حسن کو دائرہ اور کشش کو بہت کچھ خراب کر دیتا ہے اس لئے یہ ماسک پریا وہ پسند نہیں کیا اور ۱۸۲۶ء میں اردو پریس یعنی پھر کے چھاپے کے اصول پر

قاوم ہوا، آب تک عام طور پر یہی تھر کا چھاپ مقبول تھا حال میں بعض ماہرین فن نے اس پر بعض اعتراضات کئے ہیں اور اس تھر کے چھاپ کی چند دعویٰ کو پیش کیا ہے، بعض اہل الرائے کو شش کر رہے ہیں کہ تھر لوہے کے ٹائپ کو روایج دیا جائے، مختصر یہ کہ چھاپ کے روایج نے کتابوں کی طباعت اور اشاعت کے ذریعہ سے زبان کی ترقی میں بہت کچھ مدد و مددی۔

اخباروں کی آزادی ۱۸۳۵ء میں پریس ایکٹ کا لفاظ ہوا جس سے اخباروں کو تھوڑی بہت آزادی اور اردو نشر کی ترقی مل گئی، اس کے بعد فوراً ہی ۱۸۳۶ء میں جس کو آج کم و بیش ایک صدی ہو چکی ہے اردو کا پہلا اخبار مولانا آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے اردو اخبار کے نام سے لکالا اور تھر سید الاحرار بھی شایع ہونے لگا، سید الاحرار میں سر سید اور ان کے بڑے بھائی کی کوششیں شامل تھیں لیکن زیادہ تر مضمایں خود سر سید کے قلم سے لکلے تھے۔

غالب اور ان کے ۱۸۵۰ء میں یعنی آثار الصنا وید کے تین سال بعد سے غالب نے اردو میں خط و آسان طرز کی مقبولیت کتابت شروع کی اور اپنی جدت اپنی سے مکاتبہ کو مکالمہ بنادیا، مکاتبہ میں وہ بالکل اس طرح ادا کے مطلب کرتے تھے گویا دوآدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اس کے ساتھ بہت سے خطوطاً میں انسانی جذبات مثلاً رنج و غم، حسرت و خوشی، حسرت و بکیسی کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے، اکثر جگہ بعض واقعات کو اس قدر بیساختمکی سے ادا کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، اس انداز سے اردو میں ایک جدید طرز کے امکانات پیدا ہو گئے۔

سر سید کا قورٹ ولیم کالج کی نشری کوششیں، اردو کا عدالتی زبان قرار پانा، سرکاری مدارس اچھتاو کے لئے انگریزی زبان سے اردو میں کتابوں کا ترجمہ ہونا، اردو پریس کا قیام، اخباروں کی آزادی اور غالب کی نئی طرز ارشاد سب مل کر ایک غلطیم الشان اقلاب کا مواد تیار کر رہے تھے، یہ سر سید کی خوش قسمتی تھی کہ انھوں نے حالات اور واقعات کو اپنی بیش بینی کی وجہ سے بہت جلد سمجھ لیا اور اردو کے عصر جدید کے مجتہد ثابت ہوئے، یہ اقلاب ہونا تو ضرور تھا۔

اور اگر سرتیڈ نے ابتداء کی ہوتی تو یہ سعادت کسی اور کے حصہ میں آتی۔

آثار الفنادیڈ کا جب دوسرا نقش شایع ہوا تو سرتیڈ نے کتاب کی زمین عبارت کو بالکل بدل دیا اور اس کی جگہ سلیس اور عام فہم اردو کو دی، لیکن اردو پر سرتیڈ کا سب سے بڑا احسان تہذیب الاخلاق کا اجراء تھا جو جدید طرز کا سب سے زیادہ کامیاب علمبردار ثابت ہوا۔

تہذیب الاخلاق ۱۲۸۵ء میں جس کو آج کم و بیش ۶۹ برس ہوئے سرتیڈ نے قوم کی حالت کے اصلاح کے لئے تہذیب الاخلاق کا پرچہ لکالا، اس پر پے نے جو کچھ خدمت انعام دی اُس کا ذکر خود سرتیڈ کی زبان سے نئے ۱۲۹۱ء کے اختتام پر (غیری اجراء کے صرف ۴ سال بعد) تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں:-

"وہ یہ کامیار ک دن یعنی یکم شوال ۱۳۰۷ء نبوی اور ۱۲۸۵ء جیکہ ہمارا پہلا پرچہ لکلاً امید ہے کہ ہماری قوم کی تاریخ میں کبھی بھولانجاوے گا، ہماری قوم کی جو کچھ بداقبال تھی وہ ہی تھی کہ کچھ نہ تھے اور جانتے تھے کہ ہم سب کچھ ہیں، اس غفلت کے دار وئے بیہوشی نے آن کے کانوں کو بہرا کر دیا تھا آن کی آنکھوں کو تھپرا دیا تھا، و مانع قابو ہیں رہا تھا، اہاتھ پانوں سست ہو گئے تھے، زندہ تھے پر مردوں سے بدتر تھے اُٹھنے میٹھنے پلٹنے پھرتے تھے پر کچھ نہ کرتے تھے اسی تھوڑے عرصہ میں وہ حالت بہت کچھ بدل گئی کچھ لوگ بخوبی ہوشیار ہو گئے وہ سمجھے کہ ہماری کیا حالت ہے اور ہم پر کیا مصیبت ہے، بلوں پر جان ہے، پھر اگر جان ہیں تو جہاں نہیں، کچھ لوگ ہوشیار ہوئے پر ابھی آنکھیں ملتے ہیں..... بہت سونے اور اندر ہیمرے میں پڑے رہنے سے آنکھوں میں چیڑا جما ہوا ہے، کچھ کھلی ہیں مگر روشنی سے چوندھیا جاتی ہیں، کچھ لوگ ابھی تک نیند کے خمار میں ہیں کچھ حرکت تو ان میں آئی ہے مگر ابھی انگڑائی لیکر اور کروٹ بدل کر بھر غافل ہو جاتے ہیں جب پھر جن جوڑو تو "ہاں! اچھا!" کہہ کر دوسرا کروٹ لیتے ہیں اور پھر غافل ہو جاتے ہیں، کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ابھی بدستور غافل پڑے سوتے ہیں،"

ترقی علم اشارے کے سلسلہ میں سرتیڈ کا جو بیان ہے بیدا ہم ہے:-

"جہانتک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز رچوں کے

ذریعہ سے کوشش کی، مفہوموں کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا، جہاں تک ہماری کچھ بحاجت زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی بول چال کی صفائی پر کوشش کی زمگنی عبارت سے جو تشبیہ اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اُس کا اثر کچھ نہیں ہوتا پر ہر یہ کیا تاک بندی سے جو اس زمانہ میں متفقی عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا جہا ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی اور اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مفہوموں کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑتے تاکہ دل سے نکلے اور وہ میں بیٹھے، ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ کوشش کہنا تک کارگر ہوئی اور ہمارے ہموطنوں نے اُس کو کس قدر پسند کیا مگر انی بات ضرور دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آگئی ہے اور اُس کی طرف لوگ متوجہ بھی معلوم ہوتے ہیں، اخباروں کی عبارتیں نہیات عمرہ اور صاف ہوتی جاتی ہیں، وہ پہلانا پسند طریقہ ادائے مفہوموں کا بالکل جھوٹا جاتا ہے بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے لغتوں سے اردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا، صفائی اور سادگی روز بروز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے، خیالات بھی بالکل بد لے ہوئے ہیں، بہت کم اخبار ایسے ہوئے جن میں ہر منفعتہ کوئی نہ کوئی اُریکل عہدہ اور سلیمانیہ میں کسی نہ کسی مفہوم پر نہ لکھا جاتا ہو اصرفت اس بات کی کمی ہے کہ وہ سامان ہمارے پاس موجود نہیں ہے جس سے ہماری معلومات زیادہ ہوں اور ہمارے خیالات کو وسعت ہو، جو مفہوموں ہم لکھنا چاہیں اُن کے مأخذ اور اُن کے حالات اور جو بھی اس پر ہو چکی ہیں اور جو امور اُن کی نسبت متحقق ہو چکے ہیں اُن سے اگلا ہی ہوا اور یہی سبب ہے کہ بعض دفعہ ہماری قوم کے اُریکللوں میں غلطی ہو جاتی ہے اور جن امور کا تصنیفہ ہو چکا ہے اُنہیں کو پھر کے جاتے ہیں، یہ قصص اُسی وقت رفع ہو گا جبکہ انواع و اقسام علوم و فنون کی کتابیں ہماری زبان میں موجود ہو جاؤں یہی اور ہماری قوم کو عمنو اُن پر دسترس ہو گی، سائنسیک سوسائٹی علی گردھ نے اس کلام کے پورا کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر افسوس ہے کہ قوم کو اس طرف توجہ نہیں ہے اور اسی سبب سے اُس کا کام ادھورا پڑا ہے۔

نئی اردو نے ورثتی ہماری ملکی زبان میں جان ڈال دی ہے، میرودر و نظر نے اردو اشعار میں جو

کچھ سحر بیان کی ہو گئی ہو میر من و ہلوی نے کوئی کہانی شستہ بول چال میں کہدی ہو کہدی ہو جو اس سے زیادہ فتح و دلچسپ و با محاورہ نہ ہو گی جو ایک پوپلی ٹرہیا بچوں کو سلاتے وقت ان کو کہانی سناتی ہے امضمان لگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اُردو زبان میں نہ لفھی اور الہبی نہایت بچپن کی حالت میں ہے۔

سرسید اور ان کی نشر سرسید کے اجھتاویں انگریزی انشا پر داڑی کو بہت کچھ دخل ہے، سرسید میں انگریزی انشا پر داڑی کا شکل نے تہذیب الاخلاق میں بکثرت مصایب انگریزی کتابوں سے ترجمہ یا اخذ کر کے لکھے خصوصاً انگریزی انشا پر داڑی اڈیں اور اسٹائل کے طرز سے وہ خاص طور پر متاثر ہوئے تھے، اڈیں اور اسٹائل کا انگریزی ادب میں وہی درج ہے جو سرسید کو اُردو انشا میں حاصل ہوا یعنی قدیم اور تصنیع امیر انگریزی کو سدھارنے میں ان دونوں انشا پر داڑوں نے بان توڑ کو شش کی اور اڈیں کے اخبار (Spectator) نے انگریزی زبان والوں پر وہی احسان کیا جو تہذیب الاخلاق نے اُردو ادب پر کیا ہے، تہذیب الاخلاق کا سلسلہ ہوا انداز بیان اور بیساختگی اڈیں اور اسٹائل کے کارناموں کے مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، سرسید نے خود اس کا اقبال کیا ہے:-

"ہم نے نامی یورپ کے عاملوں اڈیں اور اسٹائل کے مصایب کو بھی اپنی طرز اور اپنی زبان میں لکھا ہے جہاں کہ ہم نے اپنے نام کے ساتھ A.D. اور B.C. کا اشارہ کیا ہے اور اپنی قوم کو دکھایا ہے کہ مضمون لکھنے کا کیا طرز ہے اور سماری زبان اُردو میں ان خیالات کے او اکرنے کی کیا کچھ طاقت ہے اور اگر ہماری قوم اس پر متوجہ ہو تو کس قدر اور زیادہ خوبی اور صفائی و سادگی اُس میں پیدا کر سکتی ہے۔ تہذیب الاخلاق کی عبارت سرسید کا دعویٰ ہے اور ہمیں اس سے کامل اتفاق ہے کہ اُردو انشا کا جو خاص اور وسعت مصنف ایں طرز انہوں نے نکالا اور پیش کیا با محل نرالا تھا، اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ عبارت کی سادگی اور سلسلہ ہونے سے ہر قسم کے مطالب کو اساتھی سے او اکیا جا سکتا تھا اُردو کے دور قدیم میں صرف مذہب کے مبحث پر خامہ فرسائی کی گئی، دوسرے دور میں عموماً قصے اور کہانیوں اور خیالی باتوں کو پیش کیا گیا سمجھا جائے اور کارا مدباحت کیلئے نہ اُردو سے قدیم کامحمد و دطرز کافی تھا اور نہ دور متوضطین کی زندگی اور

لکھن کام اسکتا تھا سنجیدہ اور سلچھے ہوئے مضاہین کے لئے طرز انشاء بھی ویسا ہی درکار تھا چنانچہ تہذیب الاحلاق میں عبارت کے خاص انداز کی بنار پر مختلف منفید اور کار آمد مباحث پر مضمون لکھو گئی مثلاً۔

(۱) رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات (۲) تعصیب (۳) آزادی (۴) کن کن چیزوں میں تہذیب
 چاہیئے۔ (۵) تربیت اطفال (۶) ہندوؤں میں ترقی تہذیب (۷) مہندب ملک اور نامہندب گورنمنٹ
 (۸) مذہب اور عام تعلیم (۹) تعلیم کا عام رواج بلا شمول مذہبی تعلیم کے ناممکن ہے (۱۰) تفسیر الشموات۔
 (۱۱) مذہبی تعلیم (۱۲) غیر منفید تعلیم۔

ہمیں معلوم ہے کہ سرستید سے پہلے ان مباحث پر مضاہین بالکل نہیں لکھے گئے اور جو لکھے بھی گئے وہ نہوں کے برابر ہیں، اس دور میں ہی سب سے پہلے عبارت کی سادگی نے اردو کے دامن کو وسیع کر دیا کہ ہر قسم کے علمی ملکی، تدبیحی معاشرتی تعلیمی مباحث کے ادا کرنے پر قادر ہو گئی سرستید نے اپنے ایک اردو دا انگریز دوسرت کا خط نقل کیا ہے جو لکھتا ہے کہ ”تہذیب الاحلاق نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان میں بھی ہر قسم کے مضاہین اور خیالات عدلی اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ مذہب اسلام ایسا تنگ و تاریک رستہ نہیں ہے جیسا کہ اتنک سبھما جانا رہا ہے“ بطور مثال سرستید کے مضمون ”تعصیب“ کا ایک حصہ پیش کیا جاتا ہے۔

”انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصیب بھی ایک بدترین خصلت ہے یہ ایسی بد خصلت ہے کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اُس کی تمام خوبیوں کو بر باد کرتی ہے، متعصب گواپنی زبان سے نہ کہہ سکے مگر اُس کا طریقہ یہ بات جملات ہے کہ عدل وال الفاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائص انسانی سے ہے۔ اُس میں نہیں ہے متعصب اگر کسی علطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصیب کے سبب اُس علطی سے نکل نہیں سکتا کیونکہ اُس کا تعصب اُس کے برخلاف بات کے سنتے اور سمجھنے اور اُس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اگر وہ کسی علطی میں نہیں ہے بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے تو اس کے فائدے اور اُس کی نیکی کو پہنچنے اور عام ہونے نہیں دینا کیونکہ اُس کے مخالفوں کو اپنی علطی پر متنبہ ہونے کا موقع نہیں ملتا۔“

اسی مضمون میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

”اُس کی مثال ایک ایسے جانور کی ہوتی ہے جو اپنے ریوڑ میں ملا رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ اُس کے اوپر ہجنس کیا کر رہے ہیں۔ بلکہ کیا پچھلی سائی ہے اور قمری کیا غل مچاتی ہے بیا کیا بن رہا ہے اور نکھلی کیا چڑی ہی ہر وہ بیز کوڑے کے پر کی گھاس چڑنے کے اور کچھ نہیں جانتا کہ باغ کیوں بنتا ہے اور پھول کیوں کھلا ہے نرگس کیا دیکھتی ہے اور انگور کی تماں کیا تاکتی ہے“

آن کے مضامین میں امید کی خوشی بھی ایک کارنامہ ہے۔

سرستید کی اصل اثر پردازی کا مکالمہ آن کے علمی مضامین سے معلوم ہوتا ہے اردو زبان چونکہ اس سے پیشتر کبھی علمی زبان کی حیثیت سے کام میں نہیں لائی گئی، لہذا اس میں علمی اصطلاحات، علمی الفاظ اور علمی مصطلحات بہت کم ہیں اس لئے اگر کسی علمی مسئلہ کو اردو میں لکھنا چاہو تو الفاظ مساعدت نہیں کرتے لیکن سرستید نے مشکل سے مشکل مسائل کو اس وضاحت، صفائی اور دلاؤیزی سے ادا کیا ہے کہ پڑھنے والا جانتا ہے کہ وہ کوئی دلچسپ قضیہ پڑھ رہا ہے۔

پروفیسر رینال نے جو فرانس کا ایک مشہور مصنف گذرائے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ عربی زبان میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ مخصوصاً نہ مسائل کو پیش کر سکے، یہ صرف رینال کی لاعلمی ہے، سرستید نے اردو و جیسی کم ماہی زبان میں وہ مسائل ادا کر دئے ہیں فلسفہ الہامات پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ فلسفہ کے اعلیٰ درجہ کے مسائل ہیں۔ اگرچہ سرستید کے مذہبی عقائد سے علامہ شبیل کو سخت اختلاف تھا لیکن وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سرستید نے ان مسائل کو جس طرح اردو زبان میں ادا کیا ہے کوئی اور شخص کبھی ادا نہیں کر سکتا۔

ان سب خوبیوں کے ساتھی سرستید کی تحریروں میں جگہ جگہ طرافت اور شوخی بھی مزہ دیتی ہے مگر اتنی ہی جیسے کھانے میں نک ایعنی تہذیب اور رہنمائی کبھی ہاتھ سے نہیں جاتی۔ مولوی علی بخش صاحب بدایونی مرحوم جو سرستید کے رویں رسائے لکھا کرتے تھے حریم شریفین گئے اور وہاں سے سرستید کی تکفیر کا فتویٰ لائے، اس پر سرستید نے لکھا:-

”جو صاحب ہماری تکفیر کے فتوے یعنی کو مکہ مظلومہ تشریف لے گئے تھے اور ہمارے کفر کی بدولت اُن کو حج اکبر نصیب ہوا اُن کے لائے ہوئے فتووں کو دیکھنے کے ہم بھی مشتاق ہیں۔

بیس کرامتِ بخشانہ مرا اے شیخ کہ چوں خراب شود حنا اہن داگر دد
سبحان اللہ، ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے جو کسی کو حاجی اور کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے“
مرستید کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف اپنی طرز تحریر کو بدل دیا بلکہ انہوں نے ملک کی ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا۔ اُن کے ادبی رفقار میں حالی شبلی، نذیر احمد، ذکار اللہ اردو کے بڑے محسن ثابت ہوئے جن کا ذکر اردو کے دور جدید میں مناسب ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

Printed by Faiz Mohammed Khan
at the Muslim University Press, Aligarh.

370—16.8.38—150.